106

محمد یوسف چودھری

میری لائبریری

ایک مفسرِ قرآن

مولٰنا احمد علی واقعات کے آئینہ میں

پہلی مرتبہ میری لائبریری ہی میں!

[redacted]

''حضرت والد محترم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا ، مگر شاید ایک ایسے اسلوب میں یہ ممکن نہ ہو جو طرز تحریر چودھری محمد یوسف کے قلم سے مخصوص ہے۔

یہ طرز تحریر یقیناً موصوف کو دوسروں سے منفرد کر دیتا ہے۔

یہ کتاب ہر مکتب فکر کے لئے سنگ میل اور مینار نور کی حیثیت رکھتی ہے ،''

مولانا عبیداللہ انور

امیر ، انجمن خدام الدین

ایک مفسرِ قرآن (مولانا احمد علیؒ)

بملاحظہ گرامی

جناب محمود احمد شیخ المحترم

نیاز کیش

سیہ کار اقر عبید اللہ انور

5.4.70

میری لائبریری میں تاریخ و سوانح کی دوسری کتابیں

ابوبکر صدیق اکبر	محمد حسین ہیکل	مترجم حبیب اشعر دہلوی
عمر فاروق اعظم	محمد حسین ہیکل	مترجم محمد احمد پانی پتی
دس بڑے مسلمان	محمد اسماعیل پانی پتی	
خالد سیف اللہ	ابوزید شلبی	مترجم محمد احمد پانی پتی
الہارون	عمر ابوالنصر	مترجم محمد احمد پانی پتی
الحسین ؑ	عمر ابوالنصر	مترجم محمد احمد پانی پتی
الزہرا	عمر ابوالنصر	مترجم محمد احمد پانی پتی
ابوذر غفاری	عبدالحمید جودۃ السحار	مترجم عبدالصمد صارم
امیر معاویہ	انیس زکریا نصولی	مترجم " "
امام زین العابدین	عبدالعزیز سیدالاہل	مترجم " "
انتالیس بڑے آدمی	ڈیل کارنیگی	مترجم جاوید شاہین
مانیں نہ مانیں	" "	" " "
کامیاب لوگوں کی دلچسپ باتیں	" "	مترجم ظفر عامر، جاوید شاہین
قلوپطرہ	آرتھر ویگل	مترجم ناظر حسن زیدی
رابعہ بصری	دوادالسکاکینی	مترجم عبدالصمد صارم
عمر بن عبدالعزیز	احمد زکی صفوت	" "
سلطانی محلوں کے راز	جمال پاشا الغزی، عبدالرزاق ملیح آبادی	
شیخ عبدالقادر جیلانی	حکیم غلام حیدر سہیل	
الکمال (شاہ کمال کیتھلی)	خورشید بخاری، ایم - اے، ایم، او، ایل	

ایک مفسّرِ قرآن

(مولانا احمد علیؒ)

مُصنف

چودھری محمدؐ یُوسف ایم، اے

پرنسپل : اسلامیہ کالج، لاہور کینٹ

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

میری لائبریری میں پہلی بار ۱۹۶۶
ناشر: بشیر احمد چودھری، ڈائریکٹر
مکتبہ میری لائبریری لاہور-۲
طابع: پاکستان ٹائمز پریس لاہور
بار اوّل .. .. .. ایک ہزار

فہرست

پہلی ملاقات	۱۷
ولادت	۲۲
جائے پیدائش	۲۶
ابتدائی تعلیم	۳۱
آپکے اساتذہ	۳۹
درسِ قرآن	۴۶
اشاعتِ قرآن	۵۲
فقر و استغنا	۵۷
بے لوث خدمت دین	۶۳
حلم و بردباری	۷۳
اخلاق	۷۸
پیر کامل	۸۳

حق گوئی و بیباکی ۹۱
بے غرضی ۹۷
مصلحت کیشی اور عشق حقیقی ۱۰۲
جذبہ شہادت ۱۰۷
کفر و باطل سے جہاد ۱۱۴
عالم باعمل ۱۱۹
عمومی تعلیمات ۱۲۴
مجلس ذکر ۱۲۹
وفات ۱۳۵

یہ کتاب استاذی و مخدومی عالی مرتبت
پروفیسر حمید احمد خاں وائس چانسلر پنجاب
یونیورسٹی کے نام اس درخواست کیساتھ
منسوب کرتا ہوں

شرم آید از بضاعت بے قیمتم و لیک
در شہر آبگینہ فروش است و جوہری

مولانا عبید اللہ انور
امیر انجمن خدام الدین، لاہور

تعارف

"ایک مفسر قرآن" ادبی و علمی اعتبار سے نہایت بلند پایہ تصنیف ہے۔ فاضل مصنف خود حضرت مولانا احمد علی صاحب سے زندگی کے آخری دور میں اکتساب فیض کرتے رہے اور اس ضمن میں اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار اپنے اس مضمون میں کر چکے ہیں جو ۱۹۶۰ء میں ہفت روزہ "خدام الدین" میں شائع ہوا۔ جو ایسا موثر ثابت ہوا کہ ہر طرف سے محمد یوسف چودھری ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور چھاؤنی کو اس پر اصرار کیا جانے لگا کہ موصوف والد مرحوم کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے قلم اٹھائیں میں نے ذاتی طور پر بھی درخواست کی کہ وہ اس کار خیر کو ضرور پورا کریں تاکہ ایک ممتاز شخصیت کا تعارف موزوں و مناسب انداز میں ہو سکے۔ میں بہت ممنون ہوں کہ آپ نے باوجود عدم فرصت میری درخواست کو مانا۔ اور "ایک مفسر قرآن" نام کی کتاب وجود میں آگئی جس کا انداز نگارش دل کش و دل نشین ہے الفاظ نرم و نازک ہیں جیسے گلاب کی پتی، شیریں جیسے مصری کی ڈلی مطالب و معانی بھی گنجینۂ بے بہا سے کم نہیں، مختصر یہ کہ کتاب ہر اعتبار سے بہت سودمند، دلچسپ و دل پذیر ہے۔

فاضل مصنف فقط ایک شعلہ بیاں مقرر ہی نہیں بلکہ اردو کے بہترین ادیب ہیں۔ یہ خاص عطیۂ حق ہے کہ آپ تقریر و تحریر کے محاسن سے مالا مال ہیں گو حضرت والد محترم پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا، مگر شاید ایک ایسے اسلوب میں یہ ممکن نہ ہو جو طرز تحریر موصوف کے قلم سے مخصوص ہے۔ یہ طرز تحریر یقیناً آپ کو دوسروں سے ممتاز و منفرد کر دیتا ہے۔

یہ کتاب ہر مکتب فکر کے لئے سنگِ میل اور مینار نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ پوری کتاب مرحومؒ کی شخصیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے لیکن زندگی کا ایک پہلو مصنف نے بڑی مہارت سے دکھایا ہے یعنی عالم باعمل اور خطیب راست گو۔ اس کوشش میں فاضل مصنف کماحقہٗ کامیاب ہے جو ایک مفسر قرآن کی کامیابی کی ضامن ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ فاضل مصنف کو اس کا اجرِ عظیم دے اور قارئین کتاب سے بدرجۂ اتم استفادہ کریں۔

لاہور
۲۵ دسمبر ۱۹۶۵ء

عبید اللہ انور

علامہ محمد علاؤ الدین صدیقی
چیئرمین اسلامی مشاورتی کونسل حکومت پاکستان

پیش لفظ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا اقبالؔ

خدام الدین و مخدومانِ ملت کا ایک روحانی قافلہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزشتہ چند برسوں میں جہان فانی سے نکل کر راہئی ملک بقا ہوگیا۔ عظمت کا ایک دور تھا جسے آنکھیں پھر نہ دیکھ سکیں گی۔ اس مقدس کاروان میں مفسّر، محدّث، فقیہہ، اولیا، اصفیا سب ہی شامل تھے۔ ان میں شیخ التفسیر احمد علی رح اس لئے خصوصاً قابل ذکر ہیں کہ ماضی قریب میں اس سرچشمہ فیض سے سیراب ہونے والوں کی وسیع تعداد اطراف واکناف عالم میں پھیلی ہے، خدمت قرآن حکیم کے اعتبار سے اس زمانے میں شاید ہی کسی بزرگ نے اتنی شہرت پائی ہو۔ پاکستان و ہندوستان سے باہر افریقہ، مشرق وسطیٰ، انڈونیشیا اور ملائشیا میں خود اس احقر کو ان افراد سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جنہیں اس چشمہ فیضِ قرآن سے فیضیاب ہونے کی عزت ملی۔ بلکہ بعض اوقات اس ذرّے کو (راقم الحروف) کو جو اس آفتاب سے

تعلق تھا وہ باہر کے ممالک میں بھی باعثِ صد عزت و احترام بنی۔ استاذی رح کی شہرتِ علم و عمل اقصائے عالم میں پھیلی ہے۔

محمد یوسف چودھری ایم اے نے "خدام الدین" میں ایک مفسر قرآن ایک ولی زمان" کے عنوان سے مرحوم رح کے سوانح حیات سے متعلق ایک سلسلۂ مضامین شائع کیا تھا۔ اب ان کا ارادہ ان کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ہے اگرچہ ان مضامین کا تاریخی پہلو قدرے تشنہ ہے، تاہم بہت مفید معلومات فراہم ہو گئی ہیں مصنف موصوف نے اس سیاہ کار کو چند حروف بطور پیش لفظ کے لکھنے کی فرمائش کی ہے مرحوم کا جو عظیم احسان اس احقر کی گردن پر ہے اس کے پیش نظر باوجود عدم فرصت قلم اٹھانے کا وعدہ کیا، اگرچہ تعمیل میں خاصی تاخیر ہو گئی۔

مولانا مرحوم نے نصف صدی سے زیادہ کتاب و سنت کی شاندار علمی خدمت انجام دی۔ درس قرآن حکیم، درس مشکوٰۃ شریف و درس حجۃ اللہ البالغہ ان کی تدریسی خصوصیات میں مشمول تھے۔ علماء و صلحا، ماہرین و متخصصین، طالبان شریعت اور مشتاقان طریقت غرض ہر ذوق کے تشنگان علم دین کو حسب مدارج فہم، قرآن حکیم کے معارف سے آشنا کرنا ان کا خاص کمال تھا، مغربی علوم کے دلدادگان کو علوم قرآنی کا عاشق بنا دینا ان کی کرامت تھی عوام کے دلوں میں قرآن کے ساتھ ایک والہانہ دلبستگی پیدا کر دینا ان کی دلنواز شفقت و محبت کا اعجاز تھا۔

مصنفِ کتاب کا شوق و ہمت قابل داد ہیں، سوانح حضرت شیخ التفسیر کے علاوہ زورِ قلم نے بہت سے علمی معارف بھی اس سلسلے میں منسلک کر دیئے ہیں۔ جو اربابِ ذوق کے لئے بہت مفید ہوں گے حضرت شیخ التفسیر کی پاکیزہ زندگی میں

جذبۂ خدمت دین و شوقِ حریت کا ایک حسین امتزاج تھا جس نے ایک بے پناہ قوتِ عمل کی حیثیت سے ہزاروں مردہ دلوں کو شگفتگی عطا کی، اس چراغِ روحانیت نے لاکھوں چراغ روشن کر دیئے اس روشنی کی جھلکیاں آپ کو اس کتاب "ایک مفسرِ قرآن" میں ہی ملیں گی۔

اے قدوس حق نواز جس طرح مرحوم سے قرآن حکیم کے ختم نہ ہو سکنے والے انوار و معارف کو تیرے بندوں میں عام کرنے کی کوشش کی تو بھی ان پہ اپنی رحمتوں کی ہمیشہ جاری رہنے والی بارش برسا، الٰہ العالمین ان کے جاری کردہ فیض کو ہمیشہ جاری رکھ اور ان کے جانشینوں اور نام لیوا مصنف کتاب کو توفیقِ خدمت اسلام بیش از پیش بخش ! آمین

لاہور
۱۶ مئی ۱۹۶۵ء

محمد علاؤالدین صدیقی عفی عنہٗ
صدر شعبۂ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب

سخنہائے گفتنی

حضرت مولانا احمد علی کی شخصیت پر قلم اٹھانا کوئی آسان کام نہیں کیونکہ آپ کی شخصیت گوناگوں پائدار عناصر کی حامل ہے، ایک مختصر سی کتاب میں آپ کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو نمایاں کرنا ممکن نہ تھا، تاہم آپ کی زندگی کے جس اہم پہلو پر اظہار خیال کیا گیا ہے وہ ہے آپ کی حق گوئی و بیباکی۔ یہی ایک بنیادی اور مرکزی خیال ہے جس کے گرد اس کتاب کے تمام صفحات گھومتے ہیں، یوں تو حضرت مولانا کی ذات گرامی پر دو کتابیں پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں لیکن اس کتاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کتاب کے لکھنے میں دل و دماغ سے کام لیا گیا ہے یعنی حضرت مولانا کی شخصیت کے خدوخال حقائق و واقعات کے آئینے میں اجاگر کئے گئے ہیں نہ تو کہیں آپ کو پیغمبرانہ مسند پر لا بٹھانے کی مذموم کوشش کی گئی ہے اور نہ ہی محض سوانح حیات کے لفظ سادہ پر اکتفا کیا گیا ہے کیونکہ بقول ایک فاضل کے "سوانح نگار جس کے بارے میں لکھتا ہے اس کے ماحول میں داخل نہیں ہوتا اس کے دل کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس کے دماغ کے گوشوں

کو نہیں ٹٹولتا۔ مختصر یہ کہ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور رہتے ہیں وقت اور ماحول ان کے درمیان پتھر کی دیوار بن کر کھڑا رہتا ہے۔"

مجھے اس کتاب کے لکھنے میں کئی قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اولین یہ کہ مجھے مثبت قسم کا تعمیری مواد حاصل کرنے میں سخت دقت پیش آئی۔ حضرت مولانا کے مقربین سے اس ضمن میں جب بھی رابطہ قائم کیا۔ ایک روایتی معشوق کی دلفریب اداؤں کی صورت میں عدیم الفرصتی کے بہانے سے ٹرخا دیا گیا۔ اور اگر کسی نے کچھ بتایا بھی تو اس کے بیان میں اس حد تک مبالغہ اور غلو ہوتا کہ حسن حقیقت مسخ ہو کر رہ جاتا۔ ذہنی طور پر اپنی افتادِ طبع کے باعث میں شخصیت پرستی کا قائل نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے جب بھی اس قسم کی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا میں نے ہمیشہ شخصیت کے ان بت کدوں کو تلخ حقائق کے تیشوں سے پاش پاش کر دیا۔ میری فطرت کو یہ گوارا نہیں کہ میں شخصیت پرستی کے بتِ زرنگار کے حضور دھرنا مار کر بیٹھ جاؤں، میرا شعور اور میرا ذوق و وجدان اس قسم کی روایات و خرافات کے پابند نہیں جو جادۂ مستقیم سے ہٹا کر غلط راہ پر گامزن کر دے۔ یہ کسی جاہل مرید اور ذہنی مفلس کو ہی زیب دیتا ہے کہ وہ شخصیت پرستی کے بتوں کی پوجا پاٹ کرتا پھرے، اپنا نعرۂ مستانہ ہمیشہ ہی سے یہ رہا ہے ؎

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں،
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ!

عقیدہ کی پختگی اور جذبات کی اس صحت مندی نے مجھے حضرت مولانا کی زندگی کے اسی پہلو کو نمایاں کرنے کی دعوت دی کہ وہ مردِ حق اندیش تھے، اس

میں کوئی شک نہیں کہ سوانحی خاکے بھی پیش کئے گئے ہیں لیکن ان کی حیثیت ضمنی ہے اصل چیز آپ کی حق گوئی ہے جو پوری کتاب کا سوز دروں لئے ہوئے ہے۔

پوری کتاب مولانا کی حق گوئی، حق بینی اور حق اندیشی کی مظہر ہے اور یہی چیز آپ کی ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔

میں اس موقع پر مولانا عبید اللہ انور اور علامہ علاؤالدین صدیقی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے عدیم الفرصتی کے باوجود کتاب کے بارے میں اظہار رائے فرمایا۔ آخر میں دست بدعا ہوں کہ رب کریم اس کتاب کو مقبول عام فرمائے اور عوام الناس زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

لاہور

۸ جنوری ۱۹۶۶ء

چودھری محمد یوسف ایم اے (اردو)
ایم اے (فارسی)
پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کینٹ

پہلی ملاقات

ایکدفعہ مجھے کسی ضروری کام سے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ خیال تو یہی تھا کہ غروب آفتاب تک واپس گوجرانوالہ پہونچ جاؤں گا۔ لیکن کچھ ایسے نامساعد حالات سے سابقہ آپڑا کہ مجھے شب بسری کے لئے لاہور ہی میں قیام پذیر ہونا پڑا۔ چنانچہ اپنے ایک ایسے ہمدم دیرینہ کے ہاں جا ٹھہرا جو حسنِ اتفاق سے مولانا احمد علی صاحب مدظلہ کا عقیدت مند خاص تھا۔ میرے دوست نے مولانا کا تذکرہ کچھ ایسے انداز میں کیا، جس میں خلوص، محبت اور عقیدت کا رَس گھُلا ہوا تھا۔ یہ خلوص بھری باتیں سُن کر میرے دل میں بھی مولانا سے ملنے کی خواہش جاگ اُٹھی۔

شام کا آنچل گر چکا تھا۔ رات کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔ ادھر آکاش کے سینے پر حسین و جمیل ستاروں کا قافلہ بڑی تیزی کے ساتھ منزل مقصود کی طرف رواں دواں تھا۔ لیکن میرا دوست مولانا کے ذکر میں کچھ اس طرح محو ہو گیا تھا۔ کہ اسے میرے سکون و استراحت کا احساس تک نہ رہا۔ وہ ہمہ داں راوی کی حیثیت سے گلہائے عقیدت بکھیرتا جا رہا تھا۔ اور میرا دل و دماغ ان بکھرے

ہوئے گلہائے عقیدت کی عطر بیز فضاؤں میں جھوم اٹھا۔ لیکن چونکہ میں فطرتاً ہر سُنی سنائی بات کو آسانی سے قبول کرنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں فطرت سے ایک باغی ذہن لے کر آیا ہوں، اور میرا یہ باغی ذہن کسی کے سامنے رسنِ طاعت جھکانا گوارا نہیں کرتا۔ چنانچہ میں نے اپنے فطری اور جبلّی تقاضوں کے پیشِ نظر اپنے دوست کی ان طویل باتوں کو محض حُسنِ عقیدت پر محمول سمجھا۔ لیکن نہ جانے میرے دل میں مولانا سے ملنے کی ایک غیر مرئی طاقت کہاں سے پیدا ہو گئی۔ جس نے مجھے مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے پر مجبور کر دیا وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا، یہاں تک کہ رات کی زلفیں کمر کو چھونے لگیں میں اپنے دوست سے اجازت لے کر بسترِ استراحت پر دراز ہو گیا۔

اُدھر سپیدۂ سحر حسبِ معمول نمودار ہوا۔ ننھی ننھی کلیوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ گلوں پر نکھار آ گیا۔ اور سورج کی طلائی کرنیں زمین پر سونا بکھیرنے لگیں۔ ابنِ آدم کی نقل و حرکت سے کاروبارِ زندگی میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ میں بھی حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہو کر مسجد شیرانوالہ کی جانب لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی میری ملاقات ایک پٹھان لڑکے سے ہوئی۔ جس کے چہرے پر سے جوانی کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ میرے استفسار پر۔ اس لڑکے نے مجھے بتایا کہ وہ پشاور کا رہنے والا ہے۔ اور مولانا کے ہاں محض روحانی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے آیا ہے۔

یہ پشاوری لڑکا مجھ سے انتہائی سنجیدگی اور خود اعتمادی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی باتیں خلوص، ہمدردی اور رواداری کے ملے جلے جذبات سے

مزین تھیں۔ میرا دل اس کی طہارت آمیز باتیں سُن کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور میرے ذہنی خلاؤں میں بھی عقیدت کے شگوفے کھلنے لگے۔ میں سوچنے لگا۔ کہ جس روحانی طالب علم کا یہ حال ہے، اُس کا روحانی پیشوا کیسا ہو گا چنانچہ اسی خیال سے میری زبان پر دفعتاً اقبالؒ کا یہ شعر آ گیا ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی !
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندی

حُسنِ اتفاق سے اسی پٹھان لڑکے کی وساطت سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ہاتھ آیا۔ مولانا میرے ساتھ انتہائی خلوص و ہمدردی سے پیش آئے۔ پیرانہ سالی کے باوجود آپ بڑے طمطراق سے باتیں کرنے لگے، آپ کی باتیں نرم و نازک تھیں۔ جیسے پھول کی پتّی۔ شیریں تھیں جیسے مصری کی ڈلی!

آپ کی عظیم اور بارُعب شخصیت میرے ہوش و خرد اور قلب و نظر کو مفلوج کر رہی تھی۔ مولانا کی زبان فیض ترجمان علم و عرفان کے انمول موتی اُگل رہی تھی! دھڑ مارے رعب کے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ فہم و ادراک جواب دے رہے تھے۔ اور تڑاق پڑاق باتیں کرنے والی زبان گویا مقفل ہو چکی تھی۔

اتنے میں مولانا کی شفقت نے میری آمد کی وجہ پوچھ کر میری قوت گویائی کو سہارا دیا۔ لیکن بایں ہمہ مجھے جرأت اظہار کہاں، طاقت گفتار کہاں، اور یارائے سخن کہاں، آخر ہمت کر کے اپنا مافی الضمیر بیان کر ہی ڈالا۔ مولانا نہایت شفقت محبت، متانت اور سنجیدگی سے میرے ضمیرِ خفتہ کو بیدار کرنے لگے۔ پھر کیا تھا۔

حجاب اٹھتے جارہے تھے۔ نقاب کھلتے جارہے تھے اور میں بڑے سکون کے عالم میں اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی واضح تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ مولانا کے لب ولہجہ میں دھیما پن تھا۔ آپ کا ہر فقرہ اور ہر جملہ فطرت کا دل چیر کر عکاسی فطرت کر رہا تھا۔ اعتدالِ مزاج اور سلامتِ طبع یہی آپ کی فطرت کا سب سے بڑا جوہر ہے، غالباً یہی وہ خصوصیّت تھی، جس کی بنا پر مولانا حالی کو اہل بصیرت کی بارگاہ سے خوش صفات حالی کا خطاب عطا ہوا تھا۔ میری دانست میں یہی خطاب شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب مدظلہ' کی ذات بابرکات کے لئے نہایت موزوں، مناسب اور برمحل ہے۔

مولانا کی پرخلوص باتوں سے میں جس نتیجے پر پہونچا ہوں' وہ یہ ہے کہ آپ سچی انسانیت کا احترام کرتے ہیں۔ آپ عقائد ونظریات کی باہمی آویزش میں خواہ مخواہ الجھنے سے گریز کرتے ہیں لیکن اس کوشش میں آپ نے کبھی حق گوئی، حق بینی اور حق اندیشی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مجموعی طور پر آپ کے ہر اندازِ فکر پر اعتدال وتوازن کا پہلو غالب ہے۔ مولانا کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ آپ نے قرآن حکیم کا ترجمہ بھی لکھا ہے اور اس کی تصدیق میں تقریباً سبھی مدرسہ ہائے فکر کے سربراہوں نے دستخط بھی ثبت کر دیئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ مولانا کی محض اسی فطرت کا اعجاز ہے، جس کی تہ میں اعتدال وتوازن کی نیلم پری سانس لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، اس کوشش میں آپ نے ہمیشہ اپنے پاس سے کچھ دیا ہی ہے، لیا کچھ نہیں، یہی ہمہ گیری اور یہی کشش آپ کی ابدی زندگی کی ضمانت ہے۔

مولانا کافی دیر تک مجھ سے محوِ گفت گو رہے، آپ کے ایک ایک جملے سے

فطرت کے سربستہ راز کھلتے جا رہے تھے۔ آپ کا لب و لہجہ ایسا تھا جس میں شرافت متانت، خلوص اور ہمدردی کے انمول موتی بکھرے پڑے تھے اور ہر موتی اپنے اندر ہیرے کی چمک، قوس قزح کی نرماہٹ اور اس کا گداز رکھتا تھا۔

میرا جی چاہتا تھا کہ میں مولانا کی خدمت میں کچھ دیر اور بیٹھوں، لیکن چونکہ مولانا سے ملنے والوں کا باہر تانتا لگا ہوا تھا۔ اس لئے میں نے مناسب نہ سمجھا، کہ ان عقیدت مندوں کی حق تلفی کی جائے۔ آخر اجازت لے کہ باہر جو آیا تو زبان سے یہ شعر ادا ہونے لگا ؎

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

مولانا سے میری اس ملاقات کو کئی دن ہو گئے ہیں۔ لیکن مجھے آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے میں ایک شفیق باپ، مہربان استاد، مشفق ہمدرد، اور وسیع القلب انسان سے ابھی ابھی مل کر آ رہا ہوں ؂

ولادت

مجھے فخر ہے کہ میں ایک ایسے شہر کی عطر بیز فضاؤں میں پل کر جوان ہوا، جس شہر کے علم و عرفان میں ڈوبے ہوئے ماحول نے وہ ایسی عظیم الرفعت اور عظیم المرتبت شخصیتوں کو جنم دیا، جن کا نام تا ابد زندہ رہے گا، پائندہ رہے گا۔ تابندہ رہے گا۔ اور فنا کی اندھیاریاں کبھی اور ہرگز کبھی ان کے حالات و واقعات پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔ ان میں سے ایک تو آسمان صحافت پہ بدر منیر بن کر چمکا۔ اور دوسرا علم و عرفان اور رشد و ہدایت کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو کر اپنے اطراف و اکناف میں سلوک و معرفت کے ایسے حسین و جمیل موتی اچھالتا رہا، جن کی آب و تاب اور چمک دمک کے روبرو آفتاب و ماہتاب کا جلال و جمال بے آبرو ہو کر رہ جاتا ہے۔ بھلا کون ہے جو حضرت مولانا ظفر علی خاں کے علمی ادبی اور صحافتی کمال لازوال کے حضور میں سجدہ ریز نہ ہو، اور کون ہے جو حضرت مولانا احمد علیؒ کی مذہبی، اصلاحی، تعمیری اور روحانی عظمتوں کا تہ دل سے معترف نہ ہو، اگر ایک ادیب بے بدل تھا تو دوسرا خطیب بے مثل، ایک

لاثانی تھا تو دوسرا غیر فانی۔ ایک مقرر شعلہ بیان تھا تو دوسرا مفسر قرآن تھا
ولی زمان تھا۔ صاحب علم و عرفان تھا۔ چنانچہ آج برصغیر ہند و پاک کا ذرہ
ذرّہ ان دونوں بزرگوں کی عنایات کا رسمی طور پر نہیں بلکہ تہہ دل سے احسانمند
ہے۔ کہ انھوں نے اپنی انتھک اور پرخلوص کوششوں سے سینۂ گیتی میں
ذہنی اور روحانی انقلاب کی ایک بے قرار تڑپ پیدا کر دی۔ ایک شاعر
ایک ادیب، ایک صحافی اور ایک مقرّر شعلہ بیان کی حیثیت سے مولٰنا
ظفر علی خاں کا نام تاریخ کے سینے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے گا لیکن
یہاں ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہ کرنی چاہیئے کہ تاریخ کے ہر
دور میں مائیہ ناز شعراء و ادباء جنم لیتے رہے جو اپنی اپنی استعداد و قابلیت کے
مطابق شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار سجاتے رہے لیکن آپ یقین
جانیں کہ ایسے زاہدوں، عابدوں، نیکو کاروں، شب زندہ داروں اور
پرہیزگاروں کا ہمیشہ سے کال رہا ہے۔ جن کی بارگاہِ عظمت میں شوکت سنجر و سلیم
اور شان سکندری لرز جاتی تھی۔ کانپ جاتی تھی۔ ایسے لوگوں کا وجود صدیوں
تک نصیب نہیں ہوتا جن کی نگاہ کرم نے ذرۂ ریگ کو طلوع آفتاب کا جوہر
حقیقی عطا کیا ہو، یا جن کی انگلی کے اشارے نے مسلے ہوئے پھول کو گلِ نوبہار
کا جوبن اور نکھار بخشا ہو، اس اعتبار سے مولانا احمد علیؒ دوسروں سے ممتاز
اور منفرد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں شاعروں، ادیبوں، فلسفیوں، منطقیوں اور سائنسدانوں کی
کوئی کمی نہیں۔ آپ کو ایسے لوگ بھی دستیاب ہو جائیں گے، جن کی ذہنی اور علمی

کاوشوں کے حسین امتزاج نے کسی محل کے ایک گوشۂ تاریک کو بجلی کے چراغوں سے روشن کر دیا ہو، لیکن اگر ان حضرات سے یہ کہا جائے کہ حضور ذرا دل کے ویران گوشے کو منور کرنے کا کوئی اہتمام ہو جائے تو سخت مایوسی اور بد دلی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دنیا کا کوئی شاعر، ادیب، فلسفی، منطقی اور سائنس دان اس فریضے کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ بلکہ بجز حیرت کے اظہار کے ان سے کچھ بھی بن نہ پڑے گا۔ ہاں البتہ ایک مردِ مومن کی نگاہِ کامل سے دل کی تاریکیوں اور اندھیاروں میں نورِ ہدایت کا چشمہ ابل سکتا ہے۔

آج مادیت کے اس بھیانک دور میں روحانیت کا نام لینا گناہ سمجھا جاتا ہے روحانیت کی بجائے مادیت زوروں پہ ہے۔ کفر و الحاد فسق و فجور ظلم و بربریت نقطۂ عروج پہ ہیں، شریف کی شرافت، متین کی متانت، فطین کی فطانت دم توڑ رہی ہے، حیائے مریم کا چہرہ فق ہو رہا ہے۔ عصمتوں کے ڈاکو اور شرافتوں کے لٹیرے جابجا دکھائی دیتے ہیں، جہاں کا ذرہ ذرہ معصیت کی آلودگیوں میں ڈوبا ہوا ہے، المختصر ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دلِ ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی
متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کِس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

حالات کی یہ بے راہ روی اور ماحول کی یہ بے بسی ایک مدت تک کسی مردِ کامل کے ظہور کی منتظر رہی، ذرا سنو تو وہ ایک مردِ قلندر شاہی مسجد کے زیرِ سایہ

یہ کیا گنگنا رہا ہے ؎

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مرد قلندر کی تائید میں فطرت نے خود "آمین" کہا کیونکہ ساقی کے فیضِ عام نے دنیا والوں کو وہ مرد کامل عطا کر دیا جس کی طلب و جستجو ہر مرد پاکباز کے قلب و جگر میں ایک مدت سے انگڑائیاں لے رہی تھی۔ بظاہر تو مرد درویش احمد علیؒ تھا لیکن حقیقت میں حامیٔ سنت تھا۔ ماحیٔ بدعت تھا۔ امیر شریعت تھا۔ شیخ طریقت تھا۔ مفسر قرآن تھا، ولی زمان تھا،

جائے پیدائش

گوجرانوالہ کے قرب وجوار میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو عرف عام میں جلال کے نام سے مشہور ہے۔ بظاہر تو یہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن حقیقت میں بڑے بڑے شہروں کا جلال وجمال اور رعب وطنطنہ اس گاؤں کی دیواروں میں دفن ہے۔ یہاں کج کلاہوں کے ایوان جھکتے دکھائی دیتے ہیں۔ محلات کی بلندیاں یہاں کی پستیوں کے حضور سرنگوں ہونے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ اغلباً اس کی وجہ یہ ہے کہ اس چھوٹے سے گاؤں نے اہل دنیا کو ایک ایسا صاحب جمال، صاحب جلال اور صاحب کمال عطا کیا جس کی دل سوز اور دلدوز یادیں قلب گیتی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس گاؤں کے ماحول میں لہلہاتی ہوئی فصلوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ سبزہ زاروں پہ شبنمی قطروں کا وجود اپنے اندر قوس قزح کی نرماہٹ اور اس کا گداز لئے ہوئے ہے۔ شہنشاہ مشرق صبح کے وقت جب انگڑائی لے کر بیدار ہوتا ہے تو اس کی طلائی کرنیں بہتے ہوئے چشمے کے صاف وشفاف پانی میں آنکھ مچولی کرتی نظر

آتی ہیں۔ غرض یہاں کی ہر چیز عجیب بہار دیتی ہے۔ لیکن کچے مکانوں کی سادگی و شستگی، خاموشی و دل سوزی اور سرمستی و رعنائی اس قدر جاذب نظر اور ہوشربا ہے۔ کہ ایوان شاہی کی بے مائیگی واضح طور پر ابھر کر نظر کے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ زبان و بیان اور قلب و جگر ہم آہنگ ہو کر بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سِلوں سے
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو!

لیکن مادہ پرستوں کی مادی دنیا میں اس قسم کی باتیں مہمل اور بے تکی سی معلوم ہوتی ہیں۔ کیونکہ آج ہر فرد و بشر ہر کہتر و مہتر اور ہر شاہ و گدا کے دل و دماغ میں یہ خواہش اور یہ امنگ ابھر رہی ہے۔ کہ ان کے گھر کی پستیاں محلات کی بلندیوں میں بدل جائیں۔ قصر شاہی بجلی کے چراغوں سے فروزاں ہو ہر آن اور ہر گھڑی نوکر چاکر اور حشم و خدم بارگاہ انانیت میں سجدہ ریز ہوں۔ غرض اس قسم کی ہزاروں خواہشیں ابن آدم کے قلب و جگر میں شگاف ڈال رہی ہیں۔ لیکن جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کے اس بت کدہ کے پجاریوں کو کیا معلوم کہ جو صبر و قرار اور سکون و طمانیت مٹی کے گھروندوں میں دستیاب ہوتا ہے۔ وہ بھلا عشرت کدوں میں کہاں! ان ذی شان عمارات میں خورد و نوش، آب و طعام اور نشست و برخاست کے گوناگوں لوازمات تو مہیا ہو سکتے ہیں۔ رقص و سرود کی محفلیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ الہڑ جوانیوں کا ناچ رنگ میسّر آ سکتا ہے۔ ہم نشینانِ زلیخا کے لب ہائے لعلیں کا رس مہیا ہو سکتا ہے

شراب نوشی اور عیش کوشی کی محفلیں سجی سجائی نظر آسکتی ہیں لیکن سکون و طمانیت کی وہ دولت بے بہا ان محلات کے مقدر میں کہاں جو جھونپڑوں کی سادگی سادہ دلوں کو عطا کرتی ہے۔ بھلا اونچے اونچے محلات میں رہنے والے عیش و نشاط کی گھڑیاں بسر کرنے والے بزم انبساط میں رنگ رلیاں منانے والے کیا جانیں کہ جھونپڑوں کے قدر کتنے ہوتے ہیں۔ یہ بات تو آمنہ کے لال سے پوچھو، یثرب کے چودھری اور یتیم مکہ سے پوچھو، جس نے فطرت کے اس سربستہ راز کو فاش کر دیا۔ وہ دیکھو سیّدالمرسلین چند اصحاب کی معیت میں شہر کے ایک بازار میں سے گزر رہے ہیں۔ آپ ایک اونچے مکان کی بلندی کو دیکھ کر دم بخود ہو کر رہ گئے ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مکان تو کسی جلیل القدر صحابیٔ رسول کا ہے۔ یہ سن کر دل مرتضےٰ ﷺ بے چین ہو گیا۔ بے قرار ہو گیا۔ اس مکان کا مالک یعنی صحابیٔ رسول صورت احوال سے آگاہ ہو کر دربار رسالت میں حاضر ہو کر ناراضگی رسول کی وجہ پوچھ رہا ہے۔ پیغمبر انسانیت اور فخر آدمیت نے فرمایا، اے صحابیٔ رسول! تیرے مکان کی بلندیوں اور رفعتوں سے میری امت کے غریبوں کے چہرے بجھ گئے ہیں۔ جگر کٹ گئے ہیں دل فگار ہو گئے ہیں اور جب تک تم اس مکان کی بلندیوں کو پیوند زمین ہونے کا عبرتناک درس نہیں دیتے دل مصطفےٰ خوش و خرم اور مسرور و شاداں ہو نہیں سکتا۔ یتیم مکہ کی غریب نوازی کی یہ مثال دنیا کا کوئی ریفارمر یا لیڈر پیش کر سکتا ہے؟ کاش لینن، کارل مارکس، مسولینی اور ڈارون کی تھیوری پڑھنے والے چہرۂ نبوت میں جھانک کر دیکھیں۔ امید واثق اور یقین غالب ہے کہ ان کے دلوں میں

اسلام کی حقانیت خود بخود جاگزین ہو جائے گی اور اسلام کے خلاف چلنے والی تنقید کی بے لگام زبان آنِ واحد میں کٹ کر رہ جائے گی۔ ہاں تو میں گوجرانوالہ کے نواحی گاؤں جلال کا ذکر کر رہا تھا۔ تقریباً ایک صدی قبل اسی گاؤں میں ایک ہندو سنار رہتا تھا جس کے ہاں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ باپ نے پال پوس کر جوان کیا۔ نخل آرزو پھلتے پھولتے دیکھ کر قلب پدر شاد کام ہو گیا۔ یہ بچہ عالم شباب کو پہونچا تو کاروبار تجارت اختیار کیا۔ امارت اس کی لونڈی تھی۔ اور دولت اس کی باندی تھی۔ تجارت کی غرض سے دور دراز علاقوں کا سفر کرتا رہا۔ دورانِ مسافرت میں اس غیر مسلم نوجوان کو خدا پرستوں کی ایک جماعت سے سابقہ آپڑا۔ پھر کیا تھا۔ تیغ لا الٰہ الا اللہ کی ایک ہی ضرب کاری نے اس غیر مسلم کے دل کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ کفر و الحاد سرنگوں ہو گیا۔ اور سینے کی پہنائیوں میں نور ہدایت کا چشمہ ابلنے لگا۔ یہ دریائے معرفت اپنی موجوں میں بہے جا رہا تھا۔ اور اس نوجوان کو اپنی موجوں میں بہلائے جا رہا تھا، یہاں تک کہ یہ نوجوان مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ جاہ و دولت سے بے نیاز ہو گیا۔ امارت سے روٹھ گیا۔ شان و شوکت فقر و استغنا میں بدل کر رہ گئی۔ اب یہ نومسلم غم روزگار بہلانے کے لئے گاؤں کی ایک چھوٹی سی دکان پر اکتفا کرنے لگا۔ اور زیادہ سے زیادہ وقت دین مصطفویؐ کی نشر و اشاعت میں صرف کرنے لگا۔ کہیں گاؤں کے بچوں کو قرآن پاک پڑھایا جا رہا ہے کہیں توحید کے نغمات گونج رہے ہیں کہیں حدیث رسول بیان کی جا رہی ہے۔ غرض اسی دھن میں زندگی کے لمحات گزر رہے ہیں، اور تشنگانِ دین اسی چشمۂ فیض سے سیراب ہو رہے ہیں ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اب میاں بیوی کے قدم بڑھاپے کی طرف بڑھ رہے ہیں جوانی ڈھل رہی ہے، شباب کو نیند آرہی ہے، اندریں حالات ایک بچے کی خواہش دل کو گُدگُدا رہی ہے، دستِ دعا اٹھتے ہیں، لبوں پر یہ نغمۂ سرمدی جلال خداوندی کو پکارتا ہے ؎

تو میری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
تیرے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

یہ آواز اور یہ التجا بارگاہ خداوندی میں پہونچی تھی کہ فطرت نے لبیک کہا۔ دعا گوؤں کے دامنِ تہی کو گوہر مراد سے بھر دیا۔ تمناؤں کا مسکراتا ہوا پھول مل گیا۔ آنکھوں کا تارا مل گیا۔ بوڑھی ہڈیوں کا سہارا مل گیا۔ لیکن رازِ فطرت کو کون جانتا تھا۔ کہ آج کا یہ بچہ احمد علی آنے والے دور کا مفسرِ قرآن ہے، ولیٔ زمان ہے ؎

ابتدائی تعلیم

اس میں کوئی شک نہیں کہ فرنگی قصرِ اقتدار کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ مغربی جاہ وجلال آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ زندگی کے آخری سانس گن رہا ہے۔ گویا فرنگی راج عروجِ گم گشتہ کی ایک صدائے بازگشت بن کر رہ گیا ہے لیکن بایں ہمہ مجھے یہ باور کرنے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ ہمارے معاشرے کی رگوں اور شریانوں میں فرنگی تہذیب و تمدن کا لہو جاری و ساری ہے۔ ہمارے تمدنی میلانات مذہبی رجحانات، سیاسی محسوسات اور سماجی و معاشرتی اقدامات یورپین کلچر کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، مختصر یہ کہ مغربی تمدن ہی ہمارے اندازِ تفکر کا شارح بن کر رہ گیا ہے۔ اسی نکتہ کی صراحت بیان فرماتے ہوئے حکیم الامت فرماتے ہیں ؎

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات
یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے

حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہے فرنگی مدنیت کے فتوحات

یہی وہ محرکات ہیں جن کی کوکھ سے مذہب سے بیگانگی، بے ربطی اور بے تعلقی نے جنم لیا۔ آج تقریباً ہر پیر و جواں اور ہر خورد و کلاں دین مصطفوی کی حقیقتوں سے نا آشنا نظر آتا ہے۔ سکولوں اور کالجوں کی رنگین فضائیں مغربیت سے بوجھل دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں کلچر اور ثقافت کے نام پر مشرقی تہذیب و تمدن کا خون ہو رہا ہے۔ جہاں تک دینی مدارس کا تعلق ہے۔ یہاں آپ کو ایسے لوگوں کی اکثریت نظر آئے گی۔ جو بے یار و مددگار ہیں جن کا کوئی پرسان حال نہیں جن کے اترے ہوئے، مرجھائے ہوئے چہرے گردشِ لیل و نہار کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ جن کے الجھے ہوئے بکھرے ہوئے بالوں کا دُھواں ناسازگاری حالات کا پتہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ان کا ذوق و وجدان انھیں شاہراہ اسلام پر گامزن کئے ہوئے ہے۔ اور غربت و افلاس ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ اس لحاظ سے ان حضرات کا وجود قابلِ صد احترام ہے کہ انھوں نے مروّجہ مغربیت کو ٹھکرا کر دین اسلام کی آغوش میں پناہ لے لی ہے۔ بالخصوص اس دور میں جبکہ ہر سُو مغربیت کا دور دورہ ہے اور عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ قرآن

اور اس کی تعلیمات سے کورے ہیں۔
آپ یہ سن کر حیران و ششدر رہ جائیں گے کہ ہماری قوم کے بچے "قرآن" کے نام سے ہی ناآشنا ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ آج سے تقریباً چار سال قبل میں راولپنڈی کے ایک معزز ٹھیکیدار کے مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے قیام پذیر تھا۔ اس ٹھیکیدار کا ایک نوعمر لڑکا تھا جو کسی مقامی سکول میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک روز میں نے اس لڑکے سے کہا کہ ذرا گھر سے قرآن پاک لا دو۔ میں یہ سن کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ جب کہ اس نے قرآن پاک کے بارے میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ یقیناً" ہر ذی ہوش کو یہ بات سن کر تعجب ہو گا۔ کہ ایک مسلمان باپ کا مسلمان بیٹا قرآن پاک جیسی افضل ترین کتاب کے نام تک سے واقف نہیں۔ لیکن تجربات اور مشاہدات اس قسم کے ان گنت واقعات و حوادث کے حافظ و قاری ہیں۔ قوم کے ان نونہالوں سے آپ فلمی گیت سن سکتے ہیں۔ لیکن اگر قرآن پاک کی کسی آیت پاک کی تلاوت کا مطالبہ کریں تو سخت مایوسی اور ناامیدی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہمارے محلے کی ایک خاتون نے بتایا کہ اس نے اپنی کمسن بچی کو بسم اللہ یاد کرانے کے لئے تین دن صرف کر دیئے۔ لیکن ناکامی ہوئی، اور جب اسی بچی کے بڑے بھائی نے اسے فلمی گیت ذہن نشین کرانے کی کوشش کی تو صرف چند لمحات کی کوشش بار آور ہو گئی۔ یہ حال ہے ہماری قوم کے نونہالوں کا۔ اب ذرا نوجوانوں کے مذہبی میلانات و رجحانات کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے لگائیں:

ہوا یوں کہ گزشتہ سال مجھے راولپنڈی کے ایک پروفیسر کے ہمراہ کسی تقریب میں شمولیت کی غرض سے جانے کا اتفاق ہوا۔ راستے میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مسجد کے زیر سایہ کچھ لوگ چند ایک نوجوانوں سے طہارت آمیز باتوں میں مصروف ہیں۔ اغلباً یہ تبلیغی جماعت کے کارکن تھے۔ ان کے چہروں پہ حجاب و متانت کا نور لوریاں لے رہا تھا۔ ان کی نرم گوئی قلوب کو مسخر کرنے میں تلوار کی تیز دھار کا کام دے رہی تھی، ان کے میٹھے میٹھے بول دلوں میں سوز و گداز کی ایک ہیجانی کیفیت بپا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہے تھے۔ ان کی خلوص و صداقت سے لبریز باتوں نے ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔ یقیناً متذکرہ نوجوان بھی ان پرہیزگاروں کی امرت بھری باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس تاثر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک مبلّغ ایک نوجوان کے کاندھے پر تھپکی دیتے ہوئے اسے مسجد کی جانب نماز کی ادائیگی کے لئے لے جانے لگا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شرمندگی اور ندامت سے اس کی گردن جھکی جا رہی تھی۔ اور اس کے ماتھے کی سلوٹوں میں شرم و حیا کی سرخی جذب ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی لفنگا اور شہدا کسی پاک دامن کو ایک ایسے بازار میں لے جا رہا ہو جہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ ایک زمانہ وہ تھا جب کہ سترہ سالہ جوان رعنا کفر کا کلیجہ پھاڑ کر فاتح سندھ کے نام سے موسوم ہوا اور تاریخ آج بھی اسے فاتح سندھ کے نام سے یاد کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ اب حالت یہ ہے کہ ہمارے نوجوان اسلامی روایات کے شاندار ماضی کو اس طرح بھلا چکے ہیں کہ گویا اب یہ ایک قصۂ

پارینہ اور داستان موہومہ کے سوا کچھ بھی نہیں، نوجوانان اسلام کی اس بے نیازی اور بے راہ روی سے حکیم مشرق کا دل ڈول گیا۔ چنانچہ اپنے وطن کے نوجوانوں سے یوں مخاطب ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج سلیمانی

اب جب کہ نوجوانوں کی بات چل نکلی ہے مناسب ہو گا کہ بوڑھوں کا ذکر خیر بھی ہو جائے۔ چنانچہ لگے ہاتھوں ایک بوڑھے کی روئیداد بھی سن لیں: اس روئیداد کا پس منظر یہ ہے کہ ایک شام مجھے ایک مسجد میں نماز مغرب کی ادائیگی کے لئے جانا پڑا۔ اتفاق سے اس روز امام مسجد بر وقت نہ پہونچ سکے۔ اس لئے فرائض امامت کی ادائیگی کا مسئلہ درپیش آ گیا۔ چنانچہ سب کی نگاہ انتخاب ایک ایسے بوڑھے پہ پڑی جو تقریباً زندگی کی نوّے بہاروں کا رس نچوڑ چکا تھا۔ اور اس کے چہرے پہ کی ریش دراز ہمارے انتخاب کی داد دے رہی تھی۔ یہ حضرت طوعاً و کرہاً آگے بڑھے اور فرائضِ امامت ادا ہونے لگے۔ جونہی یہ بزرگ شریف الحمد شریف پڑھ چکے تو نمازیوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ حضرات! آگے اپنی اپنی نماز پڑھ لیں۔ میں

نے تو ابتدا ہی میں انکار کر دیا تھا۔ لیکن آپ لوگ خواہ مخواہ تکلفات میں پڑ گئے۔ خیر اب مزید وقت ضائع کئے بغیر اپنی اپنی نمازیں بے تکلفی سے ادا کر لیں۔

ممکن ہے کہ آپ یہ واقعات پڑھ پڑھ کر تھک گئے ہوں اور اب مزید مطالعہ کا یارا نہ ہو۔ تاہم میں قارئین کی خدمت میں مؤدبانہ عرض کرونگا کہ آپ ایک واقعہ میری خاطر ضرور سُن لیں۔ اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بعد کوئی اور واقعہ پیش نہیں کروں گا۔ آپ کی اجازت دہی کا بہت بہت شکریہ:

اچھا حضرات گزارش یہ ہے کہ یہ اس زمانے کی بات ہے، جب کہ میں دہم جماعت کا طالب علم تھا۔ لاہور سے تبلیغی جماعت کے کچھ کارکن گوجرانوالہ میں آئے۔ جن کے ہمراہ مجھے گوجرانوالہ کے ایک نواحی گاؤں کھیالی میں تبلیغ اسلام کی غرض سے جانے کا اتفاق ہوا۔ سرِ شام ہم لوگ گردنوں کو خم دے کر گاؤں کی ایک جانب کو نکل گئے۔ راستے میں ہمیں ایک بڑھیا سے سابقہ آپڑا۔ ہم میں سے ایک صاحب اس بڑھیا سے محو گفت گو ہوئے۔ اور دوران گفت گو میں کلمہ اور اس کے ذکر کی افادیت پر روشنی ڈالنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ حضرت اس بڑھیا سے یوں مخاطب ہوئے۔

"اماں جی آپ کلمہ کی بابت بہت کچھ سن چکی ہیں اب ذرا حصول ثواب کی غرض سے کلمہ پڑھ کر سنائیں۔" وہ بڑھیا فوراً کلمہ پڑھنے لگی۔ کیا پڑھنے

لگی۔ سنیئے ذرا غور سے سنئے! بھول نہ جانا:

لا الہ الا اللہ بیں بیں محمد پاک رسول اللہ

ہمارے ساتھی نے جو اس بڑھیا کو صحیح کلمہ سمجھانے کی کوشش کی تو اس پر وہ بڑھیا برانگیختہ ہوگئی۔ اور ہم سب کو موٹی موٹی گالیاں دینے لگی۔ جب گالیاں دیتے دیتے تھک چکی تو کہنے لگی کافر کہیں کے، بے ایمان کہیں کے۔ ہمارے کلمے خراب کرانے کے لئے شہر سے آگئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے آبا و اجداد یہی کلمہ پڑھتے رہے ہیں، ان تصریحات کی روشنی میں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ ہم لوگ قرآن اور اس کی تعلیمات سے کس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں۔ میرے نزدیک مسلمانوں کی مذہب سے یہ بے گانگی انگریزی اثر و نفوذ کا نتیجہ ہے جیساکہ ابتدا میں ہی اس بات کی طرف اشارا کیا جا چکا ہے۔ ان مغرب زدوں کو آپ لاکھ سمجھائیں کہ قرآن پاک کلام الٰہی ہے اسلام کی اصل اور اساس قرآن پاک ہے۔ ہماری دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود اسی سے وابستہ ہے، یہی وہ قرآن ہے جس کے بارے میں نبی کریم نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے دن قرآن پاک سے زیادہ کوئی شے میری امت کی شفاعت کرنے والی نہ ہوگی۔ لیکن یہ ساری باتیں ان لوگوں کے لئے صدا الصحرا ثابت ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جن کے دلوں میں شیکسپیئر، شیلے، کالرج، ملٹن، ورڈزورتھ، سٹیونسن، براؤننگ کی حکمرانی ہے اتنی لمبی چوڑی تمہید سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ حضرت شیخ التفسیر اس لحاظ سے بھی انتہائی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کہ انھیں ایام طفولیت میں ہی والدہ نے قرآن پاک پڑھا دیا تھا۔ والدہ بھی وہ کہ جس نے اس گھر کو آباد کیا

تھا۔ کہ جس نے کفر کو تتاڑ کر نور اسلام اور حقیقت ایمانی سے ہم آغوشی کا سبق سکھایا تھا۔ ماں اپنے ہونہار بچے کو قرآن پاک کی تعلیم دے رہی ہے۔ حروف قرآن سے روشناس کر رہی ہے۔ یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہ بچہ جو آج توتلی زبان میں قرآن پاک کے الفاظ ادا کر رہا ہے کل یہی بچہ انہیں حروف والفاظ کا شارح ہوگا یفسر ہوگا۔ اور زمانہ اسے مفسر قرآن کا خطابِ زیبا عطا کرنے میں فخر محسوس کرے گا ؛

آپ کے اساتذہ

ایسے لوگوں کی خوش نصیبی اور نیک بختی کے وارے نیارے جائیں جنھیں کسی مرد مومن کی نگاہ کامل نے سرفرازی اور سربلندی سے ہم کنار کر دیا ہو۔ یقیناً ایسے لوگ معدودے چند ہوا کرتے ہیں، میری دانست میں حضرت شیخ التفسیر اس لحاظ سے بھی انتہائی خوش قسمت واقع ہوئے ہیں کیونکہ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کی نظر عنایت اور نگاہ کرم نے آپ کے جسم و جان اور قلب و جگر میں ذہنی انقلاب کی ایک لازوال تڑپ پیدا کر دی۔ یہی وہ تڑپ، بے چینی اور بے قراری تھی، جس نے بعد ازاں آپ کو ملک کے اندر ایک ذہنی اور روحانی انقلاب بپا کرنے میں مدد و اعانت دی۔ موقع کی مناسبت سے حکیم الامت کا یہ شعر کس قدر موزوں، مناسب اور برمحل معلوم ہوتا ہے ؎

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس موقع پر حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کا ذکر خیر بے محل نہ ہوگا بلکہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذکر خیر ان سطور میں آجائے تاکہ قارئین پر آپ کے اور شیخ التفسیر کے ذہنی اور روحانی رشتوں کی حقیقت و اہمیت واضح ہو جائے۔ حضرت مولانا عبیداللہ سندھی سیالکوٹ کے ایک معزز سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، ابھی آپ ماں کے بطن میں ہی تھے کہ باپ چل بسا۔ اس طرح آپ باپ کی پدرانہ شفقت سے ازلی طور پر محروم کر دیئے گئے۔ دو سال کی عمر کو پہونچے تو دادا بھی راہئ ملک عدم ہوا، اب ننھیال والوں نے آپ کی نگہداشت اور پرداخت کی طرف اپنی تمام تر توجہات مرکوز کر دیں۔ چھ سال کی چھوٹی سی عمر میں آپ کو ایک مقامی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں آپ پورے انہماک کے ساتھ حصول تعلیم میں مصروف اور محو و مگن ہوئے اور طلبا میں راستبازی اور حق گوئی جیسی انمول اور نایاب نعمت کی بدولت ایک امتیازی مقام حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو گئے۔ انہی ایام میں آپ کے سینے کے اندھیاروں میں نور ہدایت عکس ریز ہوا۔ اور فطرت آپ کو نوائے صبحگاہی پر مجبور کرنے لگی۔ پھر کیا تھا حجاب اٹھتے جا رہے تھے۔ نقاب کھلتے جا رہے تھے اور آپ بہت جلد ہی دولت اسلام سے مالا مال ہو گئے۔

ہوا یوں کہ آپ کو اپنے ہم مکتبوں کی وساطت سے چند ایک ایسی دینی کتب ہاتھ آگئیں جن کے مطالعہ سے آپ کے دل و دماغ میں غور و فکر اور طلب و جستجو کی ایک میٹھی سی چبھن پیدا کر دی۔ وقائع نگار یوں تو بہت سی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں مولانا عبیداللہ پائلی کی

کتاب "تحفۃ الہند" یہی وہ کتاب تھی جس کے مطالعہ نے آپ کے ذہن اور دماغ کی وسعتوں میں سمائے ہوئے کفر و شرک کو لتاڑ دیا اور نور اسلام کا ایک نرم رو چشمہ ابلنے لگا جس کے میٹھے میٹھے دل سوز نگہ تند و تیز بہاؤ نے کفر کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ اب دل تو مسلمان ہو چکا تھا۔ لیکن زبان کو یارا نہ تھا۔ کہ وہ دلی جذبات کی ترجمانی بر ملا کر سکے۔ کیونکہ اس راہ میں ماں کی محبت اور بہنوں کی شفقت کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ کچھ دیر تو یہ دبی سی آگ کی چنگاریاں دل کے اندر ہی دب کر رہ گئیں۔ لیکن بالآخر شعلہ جوالا بن کر تمام جسم و جان کو خاکستر کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ صداقت اسلام اور نور ہدایت نے باہم سازش کر کے آپ کے ہوش و خرد اور قلب و نظر کو اسیر کر لیا۔

شام کا آنچل گر چکا تھا۔ نہیں نہیں فطرت لالہ فام کا آنچل گر چکا تھا۔ رات تاریک ہو رہی تھی آسمان کے سینے پہ دوڑتے ہوئے ستاروں کا ہجوم اپنی منزل کی جانب کشاں کشاں بڑھ رہا تھا۔ کائنات کو اونگھ آ رہی تھی کہ اتنے میں مولانا کے ذوق و وجدان نے آپ کو بیدار کر دیا۔ آپ نے ماں کی ممتا اور بہنوں کی محبت کو آخری سلام کہا اور تلاش حق کی خاطر جادہ پیما ہوئے۔ ضلع مظفر گڑھ کے ایک سید کے ہاں جا فروکش ہوئے۔ یہیں آپ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ اور بوٹا سنگھ کی بجائے عبید اللہ کے نام نامی اور اسم گرامی سے موسوم ہونے لگے۔ لیکن یہاں بھی ماں اور بہنوں کی محبت نے چین نہ لینے دیا۔ چنانچہ آپ سندھ کی جانب چلے گئے۔ جہاں حضرت مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے، حافظ صاحب

اپنے دور کے جنید و بایزید تھے۔ حضرت مولانا عبید اللہ کو یہاں چند ماہ کا قیام نصیب ہوا۔ تاہم اس مختصر سی صحبت نے آپ کو معاشرت اسلامی کی حقیقتوں سے بہرہ ور کر دیا۔ مولانا حافظ صاحب کی ذات والا صفات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آپ نے حافظ جی کو اپنا دینی باپ اور روحانی پیشوا تسلیم کر لیا۔ تسلیم و رضا کے اس جوہر نے آپ کو وہ کچھ دیا جس کا بڑے بڑے شہنشاہوں کے خزینوں میں بھی دستیاب ہونا ممکن نہیں۔ چنانچہ آپ نے حافظ جی کی قیادت میں تصوف و طریقت اور سلوک و معرفت کے ابتدائی مراحل طے کر لئے۔ اس طرح عربی کی چند ابتدائی کتابوں کے مطالعہ سے اپنے ذوق و شوق کو تسکین دیتے رہے۔

تقریباً سولہ سال کی عمر میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی نے دار العلوم دیوبند میں داخلہ لے لیا۔ یہاں آپ کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی شفقت نے سہارا دیا۔ آپ کی ملتفت نگاہوں نے اس نومسلم نوجوان کی پوشیدہ عظمت کو بھانپ لیا اور اپنی نوازش و عنایات سے آپ کو سربلند فرما دیا۔ مولانا نے ایسے ہی بزرگوں کی عنایات کے زیر سایہ تمام علوم اسلامی ازبر کر لئے۔ علم و ہنر کا ایک دریا تھا جو اپنی موجوں میں بہے جا رہا تھا۔ رسول گرامی صلعم کی ذات بلند مرتبت سے آپ کو ایک خاص کھچاؤ، ایک خاص لگاؤ اور ایک خاص اٹکاؤ تھا۔ اسی جذب و کشش کا یہ نتیجہ تھا کہ آپ خواب میں رسول انام صلعم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔

دیوبند سے علوم اسلامی کی دولت بے بہا سے مالا مال ہو کر مراجعت

فرمائے سندھ ہوئے ۔ یہاں آپ قطب الاقطاب حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹی کے حلقۂ ارادت میں آ گئے ۔ امروٹ میں مطبع قائم کیا ۔ جسے دو سال تک بطریق احسن چلاتے رہے ۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں حضرت مولانا راشد اللہ صاحب نے آپ کی خاطر مدرسہ دارالرشاد قائم کیا ۔ جہاں آپ سات سال کی طویل مدت تک خدمت دین سرانجام دیتے رہے ۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ یہی وہ بابرکت مدرسہ ہے ۔ جس کے انوار و برکات کی بدولت آپ کو سید المرسلین کی زیارت کا موقع ہاتھ آیا ۔ امام مالک رح بھی اسی مدرسہ میں آپ سے خواب کی دنیا میں ملاقی ہوئے ۔ اس مدرسہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اسی مدرسہ نے شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب کو ابتدائی تعلیم کی مراعات سے بہرہ ور کر دیا ۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں آپ کی زندگی نے ایک لطیف سی انقلابی کروٹ لی ۔ حضرت شیخ الہند کی دعوت پر آپ نے دیوبند میں جمعیت الانصار کا وجود قائم کیا ۔ جو بعد میں جمعیتہ العلمائے ہند کے نام سے مشہور و معروف ہوئی ، یہی وہ زمانہ ہے جس نے آپ کے ذہن میں ایک ہنگامہ سا بپا کر دیا ۔ یعنی سکون نا آشنا زندگی سے ہمکنار کر دیا ۔ آپ چوب کلیم لے کر دانش فرنگ کو للکارنے لگے ۔ کیونکہ اس کے بغیر گزر ممکن نہیں ؎

"تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم
گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

مولانا کی انقلابی سرگرمیوں کو دیکھ کر ایوان شاہی کی جبیں عرق آلود ہو

گئی۔ چنانچہ فرنگی شعور حرکت میں آیا اور آپ کے لئے دیو بند میں تادیر رہنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ آپ کو ۱۹۱۵ء میں اپنے پیر شیخ حضرت مولانا سید تاج محمود امروٹی کے ایما پر کابل جانا پڑا۔ پھر روس، ترکی اور مکہ معظمہ کی جلالت مآب سرزمین تک اپنے انقلابی افکار کا ایک سیلاب بہا دیا۔ آپ کے ہونٹوں پر تادم آخر یہی نغمہ خیال انگیز وجد آفریں رہا۔ یہاں تک کہ موت بھی ان سے اُن کا یہ حق چھین نہ سکی۔

یہ ہیں مولانا عبید اللہ سندھی جن کا ذکر انتہائی ایجاز و اختصار سے کر دیا گیا ہے تاکہ قارئین کے اذہان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہو جائیں کہ مولانا احمد علی صاحب کو شیخ التفسیر کا خطاب عطا کرنے میں حضرت مولانا سندھی کی عنایات کا کس حد تک عمل دخل ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مولانا سندھی مولانا احمد علی مرحوم و مغفور کے سچے سرپرست ہیں یہ آپ ہی کی ذات گرامی ہے جس نے حضرت مولانا احمد علی مرحوم کو گوجرانوالہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے اٹھا کر سندھ کی سرزمین کے حوالے کر دیا۔ یہاں آپ اپنی خداداد استعداد و قابلیت کے مطابق اپنے استاد کی راہنمائی میں ترقی و ارتقا کی جانب قدم بڑھاتے رہے، یہاں تک کہ آپ مولانا سندھی کے حقیقی جانشین ہو گئے۔

۱۹۱۴ء میں آپ مولانا سندھی کے ہمراہ دہلی آ گئے اور ان کے خصوصی درس نظارت المعارف القرآنیہ میں شرکت کی اور مولانا سندھی کے کابل تشریف لے جاتے پہ ان کی نیابت کی۔ مولانا سندھی نے آپ کو سند خصوصی اور سند

نیابت عطا کی اور عہد لیا کہ زندگی بھر کلام اللہ کی تدریس کو جاری رکھیں گے۔
اللہ تعالےٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ حضرت شیخ التفسیر تاحین حیات اس وعدہ کو نبھاتے رہے جو اپنے شیخ حضرت مولانا سید تاج محمودؒ امروٹی کے رو برو کر چکے تھے۔ اسی وعدہ کی تکمیل میں آپ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ بھی وقف کر دیا۔ مہیب قسم کے مصائب و آلام سے بھی دوچار ہوئے۔ لیکن اپنے وعدہ کی آبرو کو محفوظ رکھنے میں آپ کے پائے استقلال میں کبھی اور ہرگز کبھی لغزش نہ آئی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ اپنے پیر کے سچے مرید ہیں صرف نام کے مرید نہیں بلکہ پیر کے رنگ میں رنگے ہوئے مرید ہیں۔

درسِ قرآن

عربی زبان اپنی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے دنیا کی تمام زبانوں پر حاوی اور محیط و مسلّط ہے۔ ماہرینِ لسانیات کو اس زبان کی عظمت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں۔ دنیا کی کوئی زبان کسی اعتبار سے بھی اس کی ہمسر قرار نہیں دی جا سکتی، بلاشبہ قرآن پاک کی زبان نرم و نازک ہے۔ جیسے گلاب کی کلی شیریں ہے۔ جیسے مصری کی ڈلی، اس زبان کی حقیقی عظمت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جبکہ ذہن اور شعور اس امر کی طرف واضح رہنمائی کرنے کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں کہ یہ زبان کلام الٰہی یعنی قرآن مجید اور فرقان حمید کی زبان ہے۔

بھلا کون ہے جو قرآن پاک کی طہارت و پاکیزگی اور جذب و کشش کا تہ دل سے معترف نہ ہو۔ خود حامل قرآن کا یہ عالم تھا۔ کہ ہر گھڑی اور ہر آن اسی مصحف عزیزہ کی دلربا غنائی کیفیتوں سے معمور رہتے۔ مدینہ کی نگری میں مدینہ کا چودھری گزر رہا ہے۔ ایک شکستہ گھر کی چار دیواری میں سے قرآن مجید

کی خوش کن اور دلربا آواز لحن داودی کا روپ دھار کر فضا کو مسخر کر رہی ہے خود حامل قرآن اس آواز کی شیرینی اور رنگینی و رعنائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جوں جوں اس عطر بیز آواز کا تسلسل بڑھتا جاتا ہے توں توں دل مصطفےٰ اور جگر مرتضےٰ جذب و مستی کے عالم میں جھومتا جاتا ہے۔ آخر اس گھر کے بیرونی دروازہ کی اوٹ میں کھڑا ہو کر یثرب کا چودھری عالم محویت میں مستغرق ہے ہادیٔ عالم قاری کے لب ولہجہ اور انداز قرأت پر ہزار دل سے فریفتہ ہیں کہ اتنے میں یکایک یہ آواز کہیں خلاؤں میں جا کر ڈوب جاتی ہے جیسے قرآن پاک کے میٹھے میٹھے بول اب تک ترتیب دے چکے تھے۔ فخر دو جہاں دروازے پہ دستک دیتے ہیں صحابیٔ رسول بارگاہ رسالت میں قدم بوس ہوتا ہے۔ جناب رسالت مآب ارشاد فرماتے ہیں۔ میرے پیارے صحابیؓ! تونے تلاوت قرآن حکیم کا سلسلہ منقطع کیوں ہونے دیا۔ تجھے معلوم نہیں کہ خود حامل قرآن تیرے حسنِ قرأت پہ جمال سماعت نثار کر رہا تھا۔ پیارے رسول کا لاڈلا صحابی آبدیدہ ہو کر بولا۔ حضورؐ! اگر مجھے اس حقیقت حال کا علم ہوتا تو قیامت تک تلاوت قرآن ہی میں مصروف رہتا۔ رسول گرامی جواباً پر جوش لہجہ میں یوں گویا ہوئے۔ میرے صحابی! اگر تم قیامت تک تلاوت کرتے رہتے تو یقین جانو! رسولؐ خدا بھی قیامت تک سماعت قرآن کرتا رہتا۔

یہ مختصر مگر معنی خیز واقعہ اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرنے میں مدد و اعانت کرتا ہے کہ قرآن پاک اپنے اندر قوس و قزح کی نرماہٹ اور اس کا گداز رکھتا ہے اس کا ایک ایک بول قلوب کو مسخر کرنے میں تلوار کی کاٹ کا اثر رکھتا ہے

یہ ایک نرم روچشمہ ہے۔ جس کا ارتعاش زریں روحانی اور معنوی حقیقتوں کو بے نقاب کرنے میں مدد دیتا ہے۔ یہی قرآن تھا جس کے چند ٹکڑے سُن کر عمر فاروق رضؓ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور اسلام کا سب سے بڑا دشمن سب سے بڑا حامیٔ اسلام قرار پاگیا۔ کیا یہ وہی قرآن نہیں جس کی چند آیات نے نجاشی کے دربار میں ایک انقلاب عظیم بپا کر دیا اور حالات کا رخ ادھر سے ادھر پھر گیا۔ یقیناً یہ قرآن ہی ہے جس نے ویرانوں کو بستیوں میں اور پستیوں کو بلندیوں میں بدل دیا۔ اسی کے اعجاز نے گدائے راہ کو جبین شاہی کے جلال و جمال کو پاؤں تلے روند دینے کا حوصلہ عطا کیا۔ یہ قرآن ہی تو ہے جو کربلا کی سرزمین اور چاند کی روپہلی چاندنی میں مٹھی بھر سرفروشانِ کربلا کو سکون و طمانیت کی دولت لازوال عطا کرتا رہا۔ حسین رضؓ کا کٹا ہوا سر مسلی ہوئی رگیں اور بہتا ہوا خون یاس و قنوطیت کے دورا ہے پر امید کا ایک ایسا چراغ روشن کرتا رہا۔ جسے قرآن پاک اور مصحف عزیز کی نوری آیتوں نے بجھنے نہ دیا۔ اغلباً یہی وہ حقائق ہیں جو قرآن پاک کے اس چیلنج کو برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کہ جس کسی کو ایک آیت پر بھی شک و شبہ ہے وہ صداقت کے طور پر اس جیسی ایک آیت ہی پیش کر دکھائے۔

المختصر قرآن پاک کے اعجاز و اثر کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں، آپ دور نہ جائیں اسی دور کی بات کرتا ہوں ہندوستان کے زمین و آسمان جانتے ہیں کہ یہاں ایک سید زادے کی قرآن خوانی پر ایک عالم ٹوٹ پڑتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک جلسہ عام میں اس سید زادے کی تقریر ہے۔ سٹیج پر بھارت کے

آنجہانی وزیر اعظم پنڈت نہرو بھی بن بلائے براجمان ہیں۔ پوچھا کہ صاحب آپ کیسے! کہا میں آیا نہیں لایا گیا ہوں، یعنی عطاء اللہ شاہ بخاری کی زبان سے قرآن پاک سننے کے لئے آگیا ہوں۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ قرآن پاک اور مصحفِ عزیز سے حضرت شیخ التفسیر کو ایک خاص کھچاؤ، ایک خاص لگاؤ، اور ایک خاص اٹکاؤ تھا۔ آپ تاحین حیات اشاعت قرآن کا اہم فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ اور ایک ایسے انداز میں کہ ہر پیر و جواں اور ہر خورد و کلاں آپ کے انداز بیاں پر سر دھنتا اور مسرور و شاداں ہوتا۔ صبح کے وقت جب کہ نسیم صبحگاہی کے ٹھنڈے جھونکے ماحول سے آنکھ مچولی کرتے اور رات کا کلیجہ شق کر کے صُبح جب انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تو اس وقت حضرت مولانا اہالیان لاہور کو قرآن پاک کی نزہتوں اور لطافتوں سے ہم کنار کرنے میں محو و مگن نظر آتے۔ میرا یقین محکم اور گمان غالب ہے کہ اس زمانے میں درس قرآن کا رواج نہ تھا۔ یقیناً اس کا زنجیر کا سنگ بنیاد حضرت ہی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ پھر حضرت کے خلوص و متانت اور ذہانت و ذکاوت نے اس بنیاد پر طہارت و پاک بازی کا وہ تاج محل تعمیر کیا، جسے وقت اور باد مخالف کے بے رحم جھونکے بھی مضمحل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے، حضرت کی زبان میں ایک فطری لوچ حسین بانکپن اور دل کشا طرح داری تھی شستگی و رعنائی آپ کی تقریر کا حقیقی جوہر تھا لیکن اس سادگی کے اندر بلا کی روانی برجستگی اور پرکاری تھی جو کسی چابک دست فنکار کا ہی خاصہ ہے سامع بے تامل کہہ اٹھتا

؎ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے اسد
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ادھر طاغوتی طاقتوں نے حضرت مولانا کے قصرِ عزائم کو منہدم کرنے کے لئے اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ لیکن ایک مردِ حق آگاہ طاغوتی اور فرعونی طاقتوں کے سامنے کیونکر جھک سکتا تھا جب کہ اس نے ساری زندگی صرف ایک ہی بارگاہ الوہیت میں جھکنے کا عزم صمیم کر رکھا تھا۔ یقیناً یہی وہ بارگاہ تھی جو انبیاءؑ اولیا اور صلحا کی محبوب بارگاہ تھی۔ لہٰذا حضرت مولانا کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا۔ کہ وہ انبیاء کی اس چوکھٹ سے ہٹ کر کسی اور چوکھٹ پہ ناصیہ فرسائی کرتے نظر آتے بلکہ حق تو یہ ہے کہ دنیا کی تمام چوکھٹیں صرف اسی ایک چوکھٹ کے لئے بدلی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا ہوا بھی یہی کہ حضرت مولانا نے دنیا کی تمام چوکھٹوں کو چھوڑ کر صرف ایک ہی چوکھٹ کو ہمیشہ کے لئے منتخب فرما لیا اور وہ چوکھٹ تھی بارگاہ ربوبیت کی۔ الغرض حضرت مولانا دنیوی مصائب و آلام سے ذرہ برابر بھی متردد نہ ہوئے بلکہ انتہائی پامردی سے ایام اسیری میں بھی کاروانِ اسلام کی رہبری اور رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ قیام دہلی میں مولانا سندھی کے روبرو اشاعت قرآن حکیم کے ضمن میں جو وعدہ کیا تھا اس کی آبرو محفوظ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ چنانچہ نظر بندی کے زمانہ میں بلکہ ان حالات میں جبکہ لاہور میں کوئی یار بیلی نہ تھا۔ صرف قوت پروردگار پہ کامل اعتماد کر کے لاہور ہی میں درس قرآن کا آغاز کیا۔ ابتدا میں صرف دو آدمی قرآن پاک کا درس سننے کے لئے موجود تھے۔ لیکن چند دنوں کے بعد ایک ہجوم بے پایاں تھا۔

جو والہانہ اور مجذوبانہ انداز میں شریک درس ہونے کا متمنی نظر آتا۔ حالانکہ انگریز کا اس قدر خوف اور رعب و طنطنہ تھا کہ عوام حضرت کو حکومت کا باغی سمجھ کر قریب جانا بھی مصلحتوں کے تمامتر اصولات کے منافی سمجھتے تھے۔ اس سراسیمگی کے عالم میں اس قدر شائقین درس کا ہجوم یقیناً اچنبھے کی بات ہے، ایک عام آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈوب جانے کے سوا کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا۔ لیکن اگر قارئین میرے اس خیال کو محض حسن عقیدت پر محمول نہ فرمائیں تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ جب عوام اللہ والوں کی مجلسوں میں ذاتی مصلحتوں کے تحت شریک نہیں ہوتے تو پھر خداوند قدوس کی طرف سے ایسی مجالس پاک میں فرشتے بشریت کا لبادہ اوڑھ کر شریک ہو جاتے ہیں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حضرت لاہوری کے درس قرآن میں فرشتوں نے ہی آغاز شمولیت کیا ہو۔ حق تو یہ ہے کہ حضرت لاہوری نے درس قرآن کو زندگی اور بالیدگی عطا کی۔ اور اسی درس قرآن نے حضرت لاہوری کو زندہ رکھا۔ چنانچہ آج جس طرح قرآن زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح مفسر قرآن بھی زندہ ہے اور زندہ رہیگا ؞

اشاعتِ قرآن

حضرت مولانا احمد علی صاحب قرآن پاک کی نشر و اشاعت میں انتہائی دل چسپی اور انہماک سے کام لیتے رہے ہیں یقیناً یہ ایک ایسا کارنامہ ہے۔ جس کی بارگاہ عظمت میں رسن طاعت جھکانے کو جی چاہتا ہے۔ خصوصاً اس پُر آشوب دور میں جبکہ فضا مادی رعب و طنطنہ سے بوجھل دکھائی دیتی ہے قرآن حکیم کی نشر و اشاعت کا فریضہ سرانجام دینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں آپ یہ پڑھ کر حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ کہ امرار کا مخصوص طبقہ قرآن پاک جیسی بابرکت کتاب کی تلاوت سے پہلوتہی کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ ہوا یوں کہ پچھلے دنوں مجھے ایک ایسی محفل میں جانے کا اتفاق ہوا، کہ جس میں کسی مرحوم کو ایصال ثواب کے لئے قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مجھ جیسے کئی اور سادہ دل قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف اور محو و مگن تھے لیکن یقیناً ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جو قریب ہی کرسیوں پہ براجمان قہقہوں اور چہچہوں میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ یہ لوگ تھے صاحبزادے

نوابزادے، اور امیرزادے۔ ان صاحبزادوں اور امیرزادوں میں اتنی قوت وسکت نہ تھی کہ وہ بھی قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف ہو کر اس مقصد کو پورا کرنے میں مدد دیں۔ جس مقصد کے لئے انھیں مدعو کیا گیا تھا، یہاں تک کہ ایک قریبی مسجد کے امام صاحب کی رگ احساس پھڑکی تو انھوں نے تلخی اور ملامت کے ملے جلے جذبات سے معمور ہو کر ان امیرزادوں کو قرآن خوانی کی دعوت دے دی۔ اب یہ تو نواب زادے کھسیانی بلی کی طرح دائیں بائیں جھانکنے لگے ان کے چہروں پر شرم وحیا کی سرخی اس طور لہرا رہی تھی گویا کسی منچلے نے ان کے جلالت مآب چہرے پر بھاری بھرکم تھپڑ کا غازہ مل دیا ہو۔ اس اہانت آمیز طرزعمل کے باوجود بھی ان کے احساس کا آبگینہ پگھل نہ سکا اور وہ قرآن خوانی سے اسی طرح دور رہے جیسے کہ گدھے کے سر سے سینگ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ناگفتہ بہ حالات کی موجودگی میں کسی مردحق پرست کا جذبۂ اشاعت قرآن یقیناً قابل صد احترام ہے، چنانچہ اس لحاظ سے حضرت مولانا کا وجود گرامی یقیناً باعث صد افتخار ہے۔ کیونکہ آپ تاحین حیات اسی مصحف عزیز کی اشاعت میں سرگرم عمل رہے جسے آج ہم نے دیباو حریر میں ملفوف کر کے طاق نسیاں پر دھر دیا ہے۔

حضرت مولانا کے وجدان کا عالم یہ تھا کہ بڑے سے بڑا دکھ درد بھی حضرت کو قرآن پاک کی لطافتوں سے جدا نہ کر سکا۔ یار لوگ تو معمولی قسم کے حادثات کی شدت کو برداشت نہیں کرتے۔ بلکہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر ان کا گستاخ ہاتھ دامن کبریائی تک پہونچ جاتا ہے لیکن مولانا کے ہاں

جنون و آشفتگی کا عالم ہی نرالا تھا۔ یہاں ہر شدید مصیبت غیر منتہی محبت کا سرچشمہ بن کر آلام و مصائب کے ہجوم بے پایاں کو روند دیتی ہے۔
قارئین ان سطور کو محض جذباتی سطح پر لا کر نہ دیکھیں۔ بلکہ واقعات و حقائق کی لطیف پہنائیوں میں گم ہو کر اس گوہر تابدار کو تلاش کریں جس کی چمک دمک ہر آنکھ کو خیرہ کرنے کے لئے کافی مواد مہیا کرتی ہے۔

اس ضمن میں آپ ایک واقعہ سن لیں۔ اس واقعہ کے راوی لاہور کے خواجہ نذیر احمد صاحب ہیں۔ خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ "ایک روز حضرت حسب معمول قرآن پاک کے درس میں مشغول تھے کہ اتنے میں حضرت کے صاحبزادے مولوی حبیب اللہ صاحب تشریف لے آئے اور حضرت سے سرگوشی کر کے چلتے بنے۔ تھوڑی دیر بعد مولوی حبیب اللہ صاحب پھر تشریف لائے۔ اور کان میں کچھ کہہ کر چلتے بنے۔ تیسری بار پھر آئے۔ اور اسی طرز عمل کا اعادہ کیا یعنی کان میں کچھ کہا اور چلے گئے۔ لیکن مولوی حبیب اللہ صاحب کی اس بیتابانہ آمد و رفت سے حضرت لاہوری کے درس قرآن کے اس زیر و بم میں کوئی فرق نہ آیا بلکہ درس پہلے سی باقاعدگی کے ساتھ جاری رہا
اس واقعہ کے کچھ روز بعد میں نے حضرت مولانا حبیب اللہ سے صورت حالات کی بابت آگاہی چاہی تو انھوں نے بتایا کہ پہلی دفعہ آنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرت مولانا کی بچی کی حالت بہت نازک تھی۔ دوسری دفعہ آ کر بتایا کہ زندگی کے چند لمحات باقی ہیں۔ اور رشتۂ حیات عنقریب ٹوٹا چاہتا ہے تیسری بار بتایا کہ بچی داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی ہے۔"

یہ مختصر مگر معنی خیز واقعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرنے میں مدد دیتا ہے، کہ دنیا کا کوئی دکھ درد اور رنج والم حضرت مولانا کو درس قرآن کی راہ سے ہٹا نہ سکا شدید سے شدید علالت بھی درس قرآن پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ بارہا ایسا ہوا، کہ آپ شدید علالت کے باوجود بھی درس قرآن کا فریضہ انجام دیتے رہے رسنہ ۱۹۶۰ء میں طبیعت بجد مضمحل ہوگئی۔ رات بھر اسہال ہوتے رہے جس سے قوائے بدنی بے سہارا معلوم ہونے لگے۔ لیکن جونہی رات کی آغوش سے صبح انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور مؤذن کے لحن داؤدی نے مسجد کے میناروں پر وجدانی کیفیت طاری کر دی، تو اسی وجد و مستی کے عالم میں حضرت مولانا نماز فجر کی ادائیگی کے لئے صحن مسجد میں آن پہونچے۔ نہ صرف نماز ادا کی بلکہ عمومی اور خصوصی دونوں قسم کے درس دے ڈالے یقیناً قرآن پاک سے یہ سچی محبت اور راسخ جذبہ تھا جس نے مولانا کو عہد علالت میں بھی متزلزل نہ ہونے دیا۔ حضرت مولانا کے ہاں دو قسم کے درس جاری رہے۔ (۱) عمومی (۲) خصوصی۔ عمومی اور خصوصی الفاظ کے خد و خال ہی مفہوم کو واضح کرنے میں پورے خلوص سے کام لیتے میں ظاہر ہے کہ عمومی سے مراد یہی ہے کہ جس میں شرکت عام کا اہتمام کیا گیا ہو۔ یعنی درس عمومی میں ہر قسم کے لوگ بلا لحاظ مذہب و ملت شریک ہوتے اور اپنے فہم و ادراک کو روشنی اور تابندگی کی دولت لازوال عطا کرتے لیکن جہاں تک درس خصوصی کا تعلق ہے اس میں خواص ہی شرکت فرما ہوتے۔ یہاں خواص سے مراد بادشاہ، امراء وزراء نہیں بلکہ یہاں خواص سے مراد علم دین کے بادشاہوں سے ہے جن کا خزانۂ علم نہ تو چھن سکتا ہے اور نہ کوئی رہزن اسے لوٹ سکتا ہے بلکہ اسے جس قدر لٹایا جائے اس میں اسی قدر اضافہ ہوتا ہے

المختصر درس خصوصی ہیں ہند و پاک کے دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا کو شامل کیا جاتا۔ اس درس کا آغاز یکم رمضان سے ہوتا ہے اور تین ماہ کے مختصر عرصہ میں قرآن پاک کی تفسیر اس انداز سے پڑھائی جاتی ہے کہ اس کی جزئیات تک بھی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکیں۔ خدا کا شکر ہے کہ جس کام کا آغاز حضرت لاہوری کے ہاتھوں ہوا، وہی کام اب میرے فاضل دوست حضرت مولینا عبید اللہ صاحب انور کے ہاتھوں تسلسل کی راہ پر گامزن ہے۔ باپ بیٹا دونوں ایک ہی لگن کے شکار رہیں۔ ایک ہی جذب و کشش اور ایک سی چھبن ہے۔ جس کے مزے لے لے کہ ایک تو جنت الفردوس کی عطر بیز نزہتوں میں مچل رہا ہے اور دوسرا جنت کے خزانے دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے ۔

فقر و استغنا

حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریروں میں وہی سادگی، صفائی، حلاوت روانی اور سلاست تھی جو ایک اچھے بولنے والے کی باتوں میں ہوا کرتی ہے۔ ایک بحر بیکراں ہے جو اپنی موجوں میں بہے جا رہا ہے۔ سیدھے سادھے الفاظ ریشم کے لچھے معلوم ہوتے ہیں۔ انداز بیان ایک ہموار، شفاف اور چوڑے دریا کی طرح رواں ہے۔ راہ میں کوئی رکاوٹ یا عامیانہ پن نہیں۔ سیدھے سادھے جملوں میں دل کی بات ایک ایسے انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ ایک شعلہ بیاں مقرر کی شعلہ بیانی بھی اپنا سا منہ لے کے رہ جاتی۔ آپ کے انداز خطابت میں ایک فطری لوچ اور غیر فانی سرمستی و رعنائی تھی جس سے سامع غیر ارادی طور پر جھوم جاتا۔ اور بے اختیاری کے عالم میں داد و تحسین کے نعرے بلند کرتا نظر آتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنے زمانہ طالب علمی میں حضرت کی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے لئے بڑے اہتمام سے جایا کرتا تھا۔ کوشش یہی ہوتی کہ اگلی صف میں بیٹھ کر حضرت کے ارشاداتِ گرامی سے لطف اندوز ہو سکوں۔

چنانچہ لبسا اوقات آپ کے قدموں میں بیٹھ کر آپ کے دل نشین خیالات سننے کا موقعہ ہاتھ آیا۔ آپ کا ایک ایک بول دل میں اتر جاتا۔ لبسا اوقات یوں معلوم ہوتا جیسے کوئی ماہر جراح نشتر سے زخموں کو کریدرہا ہے اور ان زخموں پر مرہم لگانے کے لئے بے چین و بے قرار ہو رہا ہے۔ آپ انتہائی وقار و متانت سے ہمہ دان مقرر کی طرح تقریر کے نشیب و فراز سے گزرتے چلے جاتے، اور اپنے پیچھے بے پناہ جذب و اثر کا طوفان چھوڑ دیتے۔ ایک ایسا طوفان جو دلوں میں احساس کی لازوال تڑپ پیدا کر دے، ادھر سامعین کا یہ حال ہوتا کہ آپ کے ہر جملے اور ہر فقرے سے قلب میں سوزو گداز کا ایک بحر بے کراں موجیں مارنے لگتا۔ اور سامع درد و گداز کی پہنائیوں میں کھو جاتا۔ آپ کی تقریر سننے کے بعد یوں معلوم ہوتا جیسے آسمان سے فرشتے اتر آئے ہیں، اور انھوں نے اہل مجلس کے چہروں کو نور کی چادر سے ڈھانپ دیا ہے۔ الغرض آپ کی تقریر درد و تاثیر کے پائیدار عناصر کی حامل تھی، کیونکہ ہر دل اور ہر دماغ اسی جذب و اثر کی لطیف کشش کا متوالا تھا لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ آخر کون سی قوت تھی جس نے حضرت کی تقریر کے سادہ جملوں کو دل سوزی و سرمستی اور رعنائی کا جوہر حقیقی عطا کیا۔ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں، صرف معمولی سے غور و فکر کی حاجت ہے ذرا تدبر و تفکر و دونوں کی انگلی تھام کر سوال کا جواب تلاش کریں۔ یقین کامل ہے کہ سوال ازخود جواب کا روپ دھار کر حاضر خدمت ہو جائے گا۔ میرے نزدیک حضرت لاہوری کی تقریروں میں بے پناہ جذب و اثر ان کی طبعی اور

فطری بے نیازی کا سبب تھا۔ وسیع تر مفہوم میں اس بے نیازی سے مراد حضرت کی وہ قلندرانہ شان ہے۔ جس کا ذکر خیر علامہ اقبال کے کلام میں بڑی خصوصیت کے ساتھ عمل میں لایا گیا ہے۔ یہی وہ قلندرانہ شان ہے جس نے حضرت کے شخصی وقار کو تا دم آخر سنبھالا دیئے رکھا۔ اگر سچ پوچھیں تو ایک آدمی فقر و استغنا کے بغیر کچھ بھی نہیں، یہی استغنا مرد کو مرد کامل بناتا ہے ۔ بلا شبہ حضرت لاہوری فقر و استغنا کی دولت لازوال سے مالا مال تھے۔ یہاں نہ تو دولت مند کی دولت و ثروت کا رعب و طنطنہ ہے اور نہ ہی شاہ کی شان و شوکت اور کرّ و فر کا لحاظ۔ بلکہ اس قلندر کی بارگاہ میں خود شوکت سنجر و سلیم دم بخود ہے۔ غربت و افلاس بھی آپ کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔ اور نہ ہی رئیسوں کے دستر خوان کے تر نوالے آپ سے آپ کی دولت استغنا چھین سکے۔ یہاں ہر قسم کی مالی مجبوریوں کا دامن تار تار دکھائی دیتا ہے۔ یاں دنیوی منفعتوں اور ذاتی مصلحتوں کی زبان گنگ ہے بلکہ حضرت کے استغنا کا عالم یہ تھا کہ آپ نے کبھی بھی کسی سے کوئی چیز بطور نذرانہ وصول نہ کی، بالفاظ دیگر یہ ایک ایسا پیر نہ تھا جو مریدوں کا لہو تک چوس لے اور شاعر یہ کہتا سنائی دے ؎

یاں اہل صلوٰۃ و اہل وضو
چوس لیتے ہیں احمقوں کا لہو
یاں دعاؤں کی فیس ملتی ہے
زر ملے تو زبان ہلتی ہے

بلکہ یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، غریب و نادار آئے تو سکون و طمانیت

کا انمول موتی لے کر جائے۔ لفنگا اور شہدا آئے تو حجاب و متانت کا جوہر زنگار لے کر جائے۔ اور اگر عالم دین آئے تو علم و عمل کی دو آنکھوں کا نور بصیرت لے کر جائے۔ یہ ہیں مولانا احمد علی صاحب جن کے ازلی اور فطری استغنا نے آپ کو دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز کر کے صرف ایک ہی بے نیاز حقیقی کے سامنے جھکا دیا۔ جس کے نتیجہ میں روح اقبال یوں زمزمہ آرا ہوتی ہے ؎

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اسکی نگاہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نکتۂ پرکارِ حق مَردِ خدا کا یقین،
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

ان اشعار کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ ساری باتیں علامہ اقبالؔ نے محض حضرت لاہوری کی ذات بابرکات کے بارے میں کہی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ایک بھی خصوصیت ایسی نہیں جو حضرت لاہوری رحؒ کی ذات گرامی میں موجود نہ ہو۔

جن لوگوں کو حضرت لاہوری کے قرب میں ہم نشینی کا موقعہ ملا ہے۔ وہ

اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ حضرت لاہوری کا مقامِ عظمت اور مقام رفعت کیا ہے۔ اور وہ میرے اس بیان کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ مذکورہ بالا اشعار کس حد تک حضرت لاہوری رح کی ذات گرامی پر صادق آتے ہیں یہاں ایک واقعہ مثال کے طور پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ قارئین پر حقیقت حال واضح طور پر بے نقاب ہو سکے۔

لوگ شادی بیاہ کے موقعوں پر حضرت لاہوری رح کو مدعو کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں لیکن یہ مرد مومن خالی ہاتھ جاتا ہے اور خالی ہاتھ واپس آتا ہے ان کے نوالہ تر سے کام و دہن کے وقار کو زخمی ہونے نہیں دیتا۔ کہتے ہیں نواب مظفر خاں مرحوم نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر حضرت لاہوریؒ کو نکاح خوانی کے لئے مدعو کیا۔ چنانچہ رسم نکاح ادا ہوئی۔ حضرت نکاح خوانی کے بعد جو رخصت ہونے لگے۔ تو لڑکی کے ماموں سر سکندر حیات خاں مرحوم ایک قیمتی دوشالے میں ایک سو روپیہ ملفوف کر کے حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ عظمت میں پیش ہوئے۔ لیکن حضرت لاہوری رح کی بے نیازی نے نہ صرف اس پیش کش کو ٹھکرا دیا بلکہ محفل طعام میں بھی شرکت سے انکار کر دیا۔

پس مفتیان دین اور اماماں متین کے لئے یہ ایک لمحۂ فکر یہ ہے۔

لیکن اے میرے وطن عزیز کے دانشورو! ان فقیہوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے جو ایسے لطیف موقعوں پر بھانڈوں کی طرح دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یقیناً میرے ان الفاظ میں شہد و انگبین کا رس نہیں بلکہ ایک ایسی تلخی و ترشی ہے جو لذت احساس کو بے مزہ کر دے۔ لیکن کیا

کروں اس کے سوا چارہ نہیں، کیونکہ حقیقت سے فرار ممکن نہیں — یہی وہ خوبی ہے جو حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے مقام عظمت میں دوچند اضافہ کرتی ہے لیکن ع

اب انھیں ڈھونڈھ چراغِ رخِ زیبا لے کر

بے لوث خدمت دین

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فقر و استغنار پہ اجمالا" تبصرہ کیا جاچکا ہے ۔لیکن یہ ایک ایسا موضوع سخن ہے ،جس میں قوس قزح کی نرماہٹ اور اس کا گداز پایا جاتا ہے۔ بارہا کی طبع آزمائی اور قلم فرسائی کے باوجود عجز قلم کو بے اختیار کہنا پڑتا ہے ؎

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

بلاشبہ یہ ایک ایسا موضوع سخن ہے جس کی تشنگی کو قرار نہیں آسکتا حضرت مولانا تاحین حیات فقر و استغنا کی دولت لازوال سے مالا مال رہے اگر سچ پوچھیں تو اسی جوہر کامل نے آپ کے نور ولایت کو جگمگایا، اور اسی کی بدولت آپ رح ولی زمان کے منصب جلیلہ پہ فائز مرام ہوئے فقر و استغنا بظاہر تو بڑے ہی سادہ الفاظ ہیں ،لیکن ذرا ان الفاظ کی سادگی میں جذب ہو کر دیکھیں تو یقین ہے آپ کو ایک جہان معنی آباد نظر آئے گا ۔تاریخ کے ہر دور میں صلحا رو اولیار اور اتقیار کا وجود گرامی منظر عام پہ آتا رہا ۔لیکن

کوئی بھی ایسا صاحب ولایت نظر نہیں آتا جو فقر و استغنا کی دولت بے پناہ سے عاری ہو۔ یا تہی داماں ہو۔ یہ ایک ایسا گوہر نایاب ہے جس کا شاہوں کے خزینوں میں بھی دستیاب ہونا ممکن نہیں۔ لیکن یہ خصوصیت حضرت مولانا کے ہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔ آپ صاحب زادوں، نواب زادوں، امیرزادوں کی مجالس میں شرکت فرما ہونے سے برابر کنی کتراتے رہے، ان کے مقابل میں کسی بڑھئی یا چمار کی دعوت میں شریک ہونا اپنے لئے باعث صد افتخار سمجھتے تھے۔ نواب مظفر خاں مرحوم ایک مدت سے اس خواہش کو جذبات کی آغوش میں پال پوس کر جوان کرتے رہے کہ کسی نہ کسی طرح حضرت مولانا کی میزبانی کا شرف نصیب ہو۔ لیکن سوئے قسمت سے جب امید کے بر آنے کا وقت آیا تو امید کا یہ چراغ بھی کسی بڑھئی کی پر خلوص پھونکوں نے بجھا دیا۔

علاوہ ازیں آپ کی ایک اور خصوصیت کا ذکر محل نظر آتا ہے بلکہ اس خصوصیت کے بیان سے آپ کی شخصیت کے چھپے ہوئے نقوش واضح طور پر ابھر کر سامنے آجائیں گے۔ اور آپ کو حضرت مولانا کے سمجھنے میں کافی سے زیادہ مدد ملے گی۔ وہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کسی بھی جلسہ یا کانفرنس میں شرکت کے لئے منتظمین جلسہ سے ایک پائی تک قبول کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ قارئین یقین جانیں کہ جب مجھے اس حقیقت حال کا علم ہوا تو میرا دل فرطِ مسرت سے بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ اس گئے گزرے دور میں اس قسم کے علماء حق کا وجود گرامی انتہائی غنیمت ہے لیکن کیا کروں ان ساری معلومات کے باوجود بھی یقین کے چہرے پر شک و اشتباہ کا گہرا پرتو نظر آتا دکھائی دیتے

لگا فہم وشعور برابر اس حقیقت کی تکذیب کرتے رہے۔ کیونکہ خودغرضوں اور ہوس پرستوں کی اس دنیا میں اس قسم کی حقیقت خواب وخیال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ غرض خیالات کی ندیا کچھ ایسے ہی نشیب و فراز سے گزرتی چلی گئی۔ اس غیر محکم یقین کا وجود صرف اس بدگمانی کی نذر کرتا ہوں۔ جو آج کے علمارِ سور کے طرزِ عمل کا شدید ردِّ عمل ہے۔ ہمارے ہاں ایسے علمار کی کمی نہیں ہے جو کسی بھی جلسہ میں شریک ہونے سے قبل اپنی فیس طے نہ کر لیتے ہوں بلکہ بعض مذہبی عیاش تو اس قسم کے ہیں کہ وہ فیس کے ساتھ ساتھ خورد و نوش اور آب وطعام کا معاملہ بھی چکا لیتے ہیں یعنی ان کے کام و دہن کو قورمہ، پلاؤ بریانی، زردہ اور حلوہ سے سروکار ہے کیونکہ زردہ اور حلوہ میں انھیں جلوۂ خدا نظر آتا ہے۔ لیکن ان شرعی کارداروں اور مذہبی ایکٹروں سے کوئی پوچھے کہ کیا پیغمبر انسانیت عوام سے فیس لے کر تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہمیں تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ رسولِ ہاشمی گالیاں سنکر اور لہولہان ہو کر تبلیغ اسلام کا کام سرانجام دیتے تھے۔ اور اگر فدک کا رئیس چار اونٹوں پر سامان لاد کر بھیجتا ہے۔ تو پیغمبر اسلام اس وقت تک گھر کی چاردیواری میں قدم رکھنا شانِ رسالت کے خلاف ایک زبردست سازش سمجھتا ہے جب تک کہ اُسے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم نہیں کر پاتا۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ہادئ اسلام اس وقت تک گھر میں داخل نہ ہوئے جب تک کہ عمر فاروق نے حاضر خدمت ہو کر یہ اطلاع نہ دے دی کہ رئیس فدک کا بھیجا ہوا تمام مال ومنال راہ خدا میں تقسیم ہو چکا

ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے۔ کہ محبوبؐ خدا کے ہاں کئی دن تک چولہے کی تہ سے دھواں اٹھتا دکھائی نہ دیا۔ اگر وفاداروں نے پیٹ پر ایک پتھر باندھا ہے تو غمخوار امت نے پیٹ پر دو پتھروں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کیا کیا یہ سچے واقعات وحقائق نہیں ہیں کیا کسی عالم دین کو ان واقعات کی حقانیت پر شبہ ہے۔ اگر نہیں تو پھر کیا بات ہے کہ آج کا مولوی ننگ مسلمانی نظر آتا ہے۔ کیا مفتیان دین سرکاری بتا سکتے ہیں کہ صحابہ رسولؐ کا طرز عمل کیا تھا۔ کیا وہ فقیروں کا بھیس بدل کر دریوزہ گری کرتے تھے جس طرح آج کے ٹکہ گدا مولوی کشکول گدائی دراز کرتے دکھائی دیتے ہیں ہماری معلومات کی زبان ہمیں تو یہ بتاتی ہے کہ پیغمبر خدا ہر قسم کے سود وزیاں سے بے نیاز ہو کر اشاعت اسلام کے فریضہ سے عہدہ برا ہوتے رہے۔ اس کوشش میں آپ کو بے محابہ خطرات سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن اللہ کا رسول نہایت پامردی سے حالات کا مقابلہ فرماتے رہے۔ آپؐ کے گلوئے مبارک کو چادر کے مروڑ سے زخمی کیا گیا بے تحاشا گالیاں دی گئیں۔ فرق مبارک پر غلاظت کا انبار پھینکا گیا مجنوں اور پاگل کے روح فرسا خطابات سے نوازا گیا۔ روح رسالت پکار اٹھی کہ جس قدر مصائب و آلام کا ہجوم فرق رسالت پر آن پڑا ہے اتنا بوجھ اگر پہاڑ پر بھی پڑتا تو یقیناً پہاڑ بھی اپنی سختی اور سنگدلی ترک کر دیتا۔ بلکہ عین ممکن ہے۔۔۔۔ پہاڑ کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ ان ساری باتوں کے باوجود ہادئ عالم کسی کو مورد احسان نہیں ٹھیراتے۔ بلکہ زبان رسالت پر بیان خداوندی اس طرح سنائی دیتا ہے:-

"اے لوگو! میرے اجر تمہارے پاس نہیں بلکہ اللہ کے ہاں ہے۔ وہی میرا منعم حقیقی ہے۔ وہی اچھا کارساز ہے، اس سے بہتر بدلہ دینے والا کوئی نہیں۔ یہ تھا طرزِ عمل پیغمبر انسانیت کا۔ اب آیئے صحابۂ کبارؓ کے طریقۂ کار کی طرف ہمیں دنیا کا کوئی مفکر، کوئی مدبر، کوئی مفسر یہ بتانے کا حوصلہ نہیں رکھتا کہ پیغمبر کے صحابہ رسول ص گرامی کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہوئے ہوں، یا یہ کہ انھوں نے ذاتی مفاد اور مالی منفعتوں کے تحت تبلیغ اسلام کا فریضہ سرانجام دیا ہو۔

صحابہؓ کے طرزِ عمل کے بارے میں جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ہم اس قدر جانتے ہیں کہ اکثر صحابۂ رسول دائرہ اسلام میں آنے سے قبل اپنے علاقہ کے رئیس تھے۔ لیکن حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد تن کو ڈھانپنے کے لئے چادر کا گوشہ تک میسر نہیں اور پیٹ کو بھرنے کے لئے نان جویں کا ٹکڑا تک بھی موجود نہیں۔

ابوبکر صدیق رضؓ کو دیکھو جنھوں نے اپنی ساری دولت راہ خدا میں لٹا دی رسول ہاشمی ص کی آنکھ کے ایک اشارے پر سارا خزانہ پانی کی طرح بہا دیا۔ فاروق رضؓ گھر کا آدھا اثاثہ لائے ہیں تو صدیق رضؓ سارا گھر اٹھا کہ بارگاہ رسالت ص میں پیش کرتے ہیں۔ پوچھا کہ میرے صدیق! کچھ گھر بھی چھوڑ آئے ہو۔ یوں عرض کناں ہوئے۔ حضورؐ! گھر میں اللہ اور اللہ کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔"

لیکن ان مذہبی بیوپاریوں کو کیا کہیں جو دین مصطفوی ص کے چہرہ گلگوں کی آب و تاب فروخت کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

مجھ کو تو سکھلا دی ہے فرنگ نے زندیقی
اس دور کے ملّا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

اگر آپ ان نام نہاد واعظوں کا علمی گریبان چاک کریں تو اس میں بد نما دھبوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آئے گا۔ یقیناً یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں مجلس میں بیٹھنے کا سلیقہ نہیں۔ بات کرنے کا ڈھنگ نہیں اور قلم کو قط لگانے کا شعور تک نہیں، لیکن بزعم خود یہ سب کچھ ہیں۔ اور مذہبی سٹیجوں پر بلا کے ادا کار ہوتے ہیں۔ زلفیں فضا میں لہرا کر اور منہ میں جھاگ چھوڑ کر کچھ اس انداز سے خوش گلوئی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے تان سین کی روح ان کی روح میں حلول کر گئی ہو۔ بد قسمتی سے ان کا سارا زور علم دماغ کی بجائے گلے میں آموجود ہوتا ہے گویا یہ لوگ اچھے خاصے قوال ہوتے ہیں۔ جنھیں عوام کی جہالت علامہ یا خطیب اعظم کی مسند پر لا بٹھاتی ہے۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ تقسیم سے قبل جو قوال محفلوں میں طبلے کی تھاپ پر رقص کناں ہوتے تھے یہی قوال آج پاکستان کے خطیب اعظم قرار پا گئے۔ تاہم ایک بات ضرور ہے کہ اس قسم کے بہروپیوں کا بہروپ بہت جلد واضح ہو جاتا ہے۔ اور انھیں پہچاننے میں کسی بھی مدت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بشرطیکہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے تھوڑا سا کام لے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مرورِ زمانہ اور امتداد روزگار کے ساتھ ساتھ علماء سوء کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ اور علماء ربانی کا وجود اب کسی کوہ گراں کا سینہ چاک کر کے جوئے شیر بہانے کے مترادف ہو گیا ہے۔ اگرچہ آج کا ہر بد تہذیب تیز گفتار اپنے آپ کو دنیا و جہاں کا سب سے

بڑا عالم ربانی گردانتا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

مجھے امید ہے کہ قارئین کرام میرے اس نظریہ کی سو فیصد تائید کریں گے کہ آج کے پڑھے لکھے طبقہ کی مذہب سے بیگانگی یقیناً اس قسم کے دین فروش مولویوں کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے اور بالآخر یہ کہنا ہی پڑتا ہے ؎

تری نماز بے حضور تیرا امام بے حضور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شان استغنا نرالی تھی۔ یہی شان آپ کو دوسروں سے ممیز کرتی ہے اور عقیدت آپ کی بارگاہِ عظمت میں جھک کر سلام عرض کرنے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ یہی شانِ دلربا آپ کو دوسروں سے ممتاز اور منفرد کر دیتی ہے اور ہمیں بجا طور پر حضرت مولانا کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ آپ کو خواہشات نفسانی کی تقلید سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ دنیا کی ہر خواہش یہاں سرنگوں نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ آزاد منش انسانوں کی دنیا میں بالکل مختلف اور جدا ہوتی ہیں یہاں حرص و آز اور خوف و ہراس کا بسیرا نہیں بلکہ خلوص و صدق اور مہر و وفا اس منڈی کی متاع عزیز ہے یہی سبب ہے کہ حضرت لاہوریؒ نے کسی جلسہ یا کانفرنس میں شرکت کے لئے کبھی کوئی رقم قبول نہیں کی اور بلامعاوضہ خدمت دین کے لئے دور دراز علاقوں تک کا سفر کرنے میں کوئی اعتراض نہ کیا۔ ایک دفعہ نواب محمد حیات

قریشی آف سرگودھا نے آپ کو دعوت تبلیغ دی۔ آپ نے اس شرط پر قبول فرمایا کہ میرے قیام و طعام کے جملہ لوازمات سے آپ بے فکر رہیں۔ چنانچہ آپ سرگودھا میں تبلیغ اسلام کی غرض سے تشریف لے گئے۔ رات مسجد میں قیام فرماتے اور مسجد میں خشک روٹیاں استعمال میں لاتے۔ جو گھر سے پکوا کر لے گئے تھے۔ اسی طرح حضرت ایک بار ریاست سوات میں تبلیغ اسلام کی غرض سے تشریف لے گئے، اپنے ہمراہ میٹھی روٹیاں پکوا کر لے گئے مگر "اتفاقاً" داڑھوں میں درد شروع ہو گیا جس سے روٹی کھانا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ مسلسل آٹھ دن تک صرف دو پیسے کے ٹماٹر پر گزارہ کرتے رہے۔

اس ضمن میں ایک اور واقعہ سن لیجئے! کہتے ہیں ایک بار حضرت بہاولپور تشریف لے گئے تاکہ اشاعت اسلام کا فریضہ سر انجام دے سکیں۔ گلی گلی اور قریہ قریہ پہونچے۔ لیکن آپ کی شان استغنا نے آپ کو کسی کے ہاں فروکش نہ ہونے دیا۔ جب بھوک زیادہ ستاتی تو بھنے ہوئے چنے گڑ کے ہمراہ کھا لیتے اور اس طور شب و روز بسر ہونے۔ حضرت کی شان استغنا کبھی اور ہرگز کبھی کسی امارت کدہ پر خمیدہ نہ ہوئی۔ آپ بالکل ٹھیک فرماتے تھے کہ احمد علی کے ٹوٹے ہوئے جوتا کی توہین ہے کہ وہ امیروں کے دروازے پر کسی ذاتی غرض کے تحت چل کر جائے۔ بلاشبہ آپ تاحین حیات اسی اصول کی راہ پر گامزن رہے اور دنیا کا کوئی لالچ آپ کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکا۔

گوجرانوالہ کے ایک ثقہ بزرگ فرماتے ہیں کہ یہاں کے ایک متموّل کارخانہ دار نے آپ کو مدعو کیا۔ اس دعوت میں گوجرانوالہ کے جید علما شریک تھے۔ جن میں

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل کا نام نامی اور اسم گرامی خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ حضرت لاہوری بھی حسب وعدہ گوجرانوالہ تشریف لے گئے۔ ضروری پند و نصائح اور دعائے خیر کے بعد حضرت نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی لیکن آپ کو شریک طعام ہونے کے لئے بے حد اصرار کیا گیا۔ حضرت لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کی شان استغنا اس دعوت طعام میں بھی شرکت فرما ہونے کے لئے رضا مند نہ ہوئی جس میں ذی علم علماء کرام شرکت فرما چکے تھے۔ کارخانہ دار کی اس پر تکلف دعوت میں شیخ الحدیث، اور شیخ القرآن بے تکلفی سے کھاتے پیتے رہے۔ لیکن مفسر قرآن ایک سرمایہ دار کے تر نوالوں سے اپنے کام و دہن کو آلودہ کرنے پہ آمادہ نہ کر سکا۔

اس قسم کے ان گنت اور بے شمار واقعات و حقائق سے حضرت مولانا کی تاریخ زندگی بھری پڑی ہے جہاں سے اٹھا دیکھیں ایک عالم ہے۔ طوالت کے خوف سے ان تمام واقعات کو سپرد قلم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ ورنہ اگر ان تمام واقعات کو یکجا کر دیا جائے تو یقین ہے کہ ایک ضخیم کتاب منصۂ شہود پر آ جائے۔ تاہم ایک اور واقعہ پیش خدمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس سے حضرت مولانا کی شان استغنا کھل کر نظر کے سامنے بے نقاب ہو جائے گی۔

کہتے ہیں کہ حضرت کے ایک مرید خاص نے حضرت کو ایک کار یہ کہہ کر پیش کی کہ اس کے جملہ مصارف وہ بذات خود برداشت کریگا۔ ظاہر ہے کہ جو عمر بھر بیکاروں کا حامی و ناصر رہا، اس سے کیونکر ممکن تھا کہ وہ معشوقۂ طناز کی طرح اٹھکیلیاں کرنے والی کار کی آقائی قبول کرتا۔ لہٰذا آپ نے حسب عادت اس

پیش کش کو بھی مسترد فرمایا۔

غرض آپ کے فضائل و مناقب کہاں تک بیان کروں۔ ذہن عاجز آگیا ہے۔ قلم تھک گیا ہے، کاغذی پیرہن تار تار ہے اور موضوع ہے کہ برابر تشنگی محسوس کر رہا ہے ؎

حلم وبردباری

حضرت مولانا کے شخصی خصائص و محاسن میں سے ایک خوبی کا ذکر نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ انتہائی درجہ کے حلیم و بردبار تھے۔ غیر منتہی آلام و مصائب کے ہجوم میں بھی حلم و بردباری کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اغلباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علم و حلم دونوں نے متفقہ طور پہ آپ کو شیخ التفسیر کا رتبۂ عالی عطا کرنے میں مدد و اعانت دی۔ بلاشبہ یہ ایک ایسا گوہر تابدار اور لولوئے شاہوار ہے جس کا امرا اور سلاطین کے ہاں بھی دستیاب ہونا ممکن نہیں۔ یقیناً فلسفۂ اخلاق ہی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ اور اسی کی بدولت آدمیت اور انسانیت کی بکھری اور الجھی ہوئی زلفیں سنورنے میں آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رب کریم نے اپنے رسول گرامی کو اخلاق عالیہ کی تمام تر صفات سے متصف فرما کر مبعوث فرمایا۔

ہادیٔ اسلام خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میری بعثت کا مقصد یہی ہے۔ کہ مکارم اخلاق کا ایک ایسا تاج محل تعمیر کروں جو حسن و جمال اور جاہ و جلال

کی ایک چلتی جاگتی تصویر ہو۔ جنابہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے کسی نے دریافت کیا۔ کہ محبوب خدا کا خلق کیسا تھا۔ اس سوال کے جواب میں رسول پاک کی عصمت مآب بیگم نے برجستہ کہا: اے صحابئ رسولؐ! کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ یقین جانو پیغمبر خدا چلتا پھرتا قرآن ہے۔ جس طرح قرآن پاک کا ایک ایک لفظ خلق عظیم کی حسین وجمیل تصویر ہے بعینہٖ پیغمبر خدا خلق عظیم کی چلتی پھرتی تفسیر ہے۔

حضرت مولانا پرلے درجے کے حلیم و بردبار تھے کسی سے خواہ مخواہ تصادم ہونا آپ اپنے منصب کے خلاف سمجھتے تھے۔ حضرت کی فطرت میں حد درجہ نرمی اور ملائمت سرایت کر گئی تھی۔ سلامت طبع اور اعتدال مزاج آپ کی فطرت کا نکھار ہیں۔ گویا ایک بحر بیکراں ہے جو اپنی روانی میں بہے جا رہا ہے راہ میں کہیں کہیں گرداب ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں تلاطم خیز موجوں کا جال بنا ہوا ہے۔ اور کہیں حادثات کا سیل رواں ہے۔ تاہم حضرت کا فطری اور جبلی سکون اس سمندر میں کوئی بلاخیز طوفان پیدا نہیں ہونے دیتا۔ کہتے ہیں کہ بڑھاپا تلخیٔ مزاج کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور طبع انسانی کی تمام تر شگفتگی کا لہو نچوڑ دیتا ہے۔ لیکن قرائن بتلاتے ہیں کہ حضرت مولانا کے ہاں صورت حال دگرگوں ہے یہاں پیرانہ سالی مزاج پر غالب نہیں آئی، ایک نرم رو چشمہ ہے جس کی زمزمہ آرائی سے ہر جاندار لطف اندوز ہوتا ہے۔ آپ کی ذات گرامی سے نہ دوستوں کو گلہ ہے اور نہ دشمنوں کو شکایت۔ میرے فاضل دوست مولانا عبید اللہ انور صاحب بجا فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا قوم کی مشترکہ امانت ہیں۔

یعنی ہر فرد و بشر بلا لحاظ مذہب و ملت آپ کی بارگاہ عظمت میں رسن طاعت جھکانے پر مجبور رہے۔ آپ نے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا تو اس کی تصدیق میں سبھی مکتبہ ہائے فکر کے سربراہوں نے مہر تصدیق ثبت کر دی۔ یہ نتیجہ ہے حضرت کے اخلاق کی بلندی کا۔ اخلاقی اعتبار سے بھی آج کا کوئی صاحب اخلاق آپ کا ہمسر نہیں۔ آپ نے کسی کو نیچا دکھانے کا تصور تک نہیں کیا۔ حالانکہ میرے عقیدہ کے مطابق وہ مولوی ہی کیا جو دوسروں کی تحقیر کا موجب نہ بنے یا جو زلف انانیت کا اسیر نہ ہو۔ یہاں ایک نکتہ کی صراحت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ میرے نزدیک حضرت مولانا "مولوی" نہ تھے بلکہ ایک درویش تھے جو کسی سے الجھاؤ پیدا کرنا شان درویشی کے خلاف ایک زبردست سازش سمجھتے ہیں ہم جانتے ہیں کہ وقت کے نام نہاد ملاؤں نے آپ کو کئی بار نظری بحثوں میں الجھانے کی کوشش کی لیکن حضرت کی میانہ روی اور فطری میلان طبع نے آپ کو اس قسم کی گمراہیوں سے محفوظ رکھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کوشش میں حق و صداقت کا دامن تار تار ہونے دیتے بلکہ سچائی اور صداقت کی سرفرازی اور سربلندی کے لئے ایک مضبوط چٹان کی طرح جم جاتے۔ ہاں عوام کو نظری بحثوں میں الجھانا کم عقلی اور کج فہمی کی بدترین مثال سمجھتے تھے۔ یعنی جھوٹے وقار کے حصول کے لئے متنازعہ فیہ مسائل کو ہوا دینا آپ کسر شان سمجھتے تھے۔ پچھلے دنوں ہمارے ہاں حیات النبیؐ کا مسئلہ اپنی پوری شان اور سج دھج کے ساتھ عوام کی جہالت کو فریب دیتا رہا اگر ایک حقیقت کا انکشاف کرنا جرم نہیں ہوتا تو مجھے یہ کہنے میں قطعاً کوئی باک نہیں کہ اس مسئلہ کو ہوا دینے والے صرف وہی اقتدار پرست مولوی تھے

جو کسی قیمت پر بھی ایسے موقعوں کی لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ غرض اس مسئلہ نے اختلاف کی راہیں کھول دیں۔ حضرت مولانا نے بھی ایک مردِ حق آگاہ کی طرح اپنے نظریہ کی صراحت فرما دی اور آپ کی تائید میں پاکستان کے تقریباً تمام علماء کرام نے بیانات جاری کئے۔ لیکن پاکستان کے صرف چند علماء کو کوئی بھی معقولیت قائل نہ کر سکی۔ وہ جابجا اپنی تحقیق و تدقیق کے دعوے کرتے رہے۔ لیکن مقابل میں وہ ذات گرامی تھی جو کسی سے متصادم ہونے کے نام سے ہی آشنا نہ تھی۔ ان علماء کے علاوہ بھی مذہب و شریعت کے بعض دعویداروں نے بہتیری کوشش کی کہ آپ سے متصادم ہوا جائے لیکن حضرت لاہوریؒ کے محتاط لب و لہجہ نے کسی کو منہ نہ آنے دیا۔

آپ نے فرمایا: "احمد علی کوئی ایسی بات نہیں کرے گا۔ جس سے عوام میں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھے، نیز یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ تو محض تحقیق کی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن احمد علی باطن کی روشن آنکھوں سے دیکھ کر کہتا ہے کہ پیغمبران عظام اپنی اپنی قبروں میں زندہ و پائندہ باد ہیں۔"

حضرت لاہوریؒ کے اس شریفانہ فعل سے بھی ان مولوی صاحب کی چیرہ دستیوں کو سکون نہ مل سکا بلکہ انتہائی ڈھٹائی سے یہ کہتے سنائی دینے لگے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب کو متنازعہ فیہ مسئلہ کے ضمن میں چیلنج کیا گیا۔ لیکن حضرت لاہوری طرح دے گئے:

ان مولویان بے نام کو کون بتائے کہ حضرت لاہوری فی سبیل اللہ فساد کے

قائل نہ تھے ۔ وہ تو شرافت و نجابت کے حسین پیکر تھے ۔ حجاب و متانت آپ کی کتاب زندگی کا ایک سنہری باب تھا ۔ لیکن یار لوگ اپنی اپنی ہمت و استعداد کے مطابق حضرت لاہوری کی ذات گرامی کا تجزیہ کرتے رہے ۔ میرے خیال میں حضرت لاہوری کا سب سے بڑا کمال ان کا حسن اخلاق خلق اور جذبہ روا داری تھا ۔ اور یہی وہ عنصر ہے جس سے آپ کی سیرت کا تاج محل تعمیر ہوتا ہے ۔

اخلاق

بلاشبہ حضرت مولانا کی کتاب زندگی ان گنت اور بے شمار خوبیوں سے بھرپور ہے۔ ان تمام خوبیوں کو یک جا کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ طوالت کا خوف اور نوک قلم کی درماندگی کو اعتراف عجز کے سوا چارہ نہیں۔ تاہم آپ کے بعض ذاتی محاسن کا ذکر و اذکار نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کے بغیر آپ کی کتاب زندگی نامکمل ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ کے ذاتی اوصاف و محاسن کے ساتھ ساتھ قاری کے لئے ضروری ہے کہ وہ لمحہ بھر کے لئے "حامل خلق عظیم" کے اخلاقی محاسن کو پیش نظر رکھ کر حضرت مولانا کے حسن اخلاق کا تحقیقی تجزیہ کرے۔ ہادیٔ اسلام کے خلق عظیم کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ذہن کسی بھی ایسی فرسودگی اور پامالی کو راہ میں حائل ہونے نہیں دیتا۔ جو حضرت مولانا کے اخلاقی محاسن کو خلق مصطفوی کی مطابقت میں اپنی مجوزہ راہ اختیار کرنے میں بخل سے کام لیتے ہوں۔ اگر قارئین میری اس رائے کو محض حسن عقیدت پر محمول نہ فرمائیں تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ

حضرت مولانا کی زندگی کا ہر قدم رسول ہاشمی کے نقش قدم کے عین مطابق اٹھتا رہا۔ اغلباً اسی نقطہ نگاہ کی صراحت حضرت امیر شریعت سید عطا اللہ شاہ صاحب بخاری نے اس طرح فرمائی۔ کہ مولانا احمد علی مرحوم صحابہ کے قافلہ سے بچھڑ گئے۔ یقیناً جس طرح صحابۂ رسول محبوب خدا کے نقش قدم پہ چلتے رہے۔ بعینہٖ حضرت مولانا مرحوم رسول گرامی کی متعین کردہ راہ پہ چلنے کے لئے زندگی بھر کوشاں رہے۔ ہم نے مختلف مذہبی کتابوں میں پڑھا ہے کہ آمنہ کا لال ؐ اپنوں کے علاوہ غیروں کا بوجھ اٹھا لینے میں بھی عار محسوس نہ کرتے تھے یہانتک کہ اس کافر بڑھیا کا بوجھ اٹھا کر اس کے گھر تک پہونچا دیا۔ جو محض اس لئے اپنے وطن کی عطر بیز فضاؤں کو الوداع کہہ کر ایک اجنبی ماحول کی تلخی کو اپنے لئے گوارا سمجھتی تھی کہ کہیں ایک جادوگر کی فسوں گری کا نشانہ نہ بن جائے۔ جس جادوگر کی جادوگری سے یہ بڑھیا خوف زدہ تھی۔ اس سحر آفریں نے اس بڑھیا کا بوجھ اٹھا کر خلق عظیم کے جادو کے زور سے اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا والہ و شیدا بنا لیا۔ یقیناً یہی وہ شمشیر اخلاق تھی جس کے ایک وار سے حضرت مولانا بڑے سے بڑے مغرور کی گردنِ غرور کو جھکا دیتے۔

ہم ذیل میں ایک ایسا واقعہ نقل کرتے ہیں جس کے پڑھنے سے قارئین بہت جلد ہماری اس رائے سے اتفاق کرنے لگیں گے۔ کہ واقعی حضرت مولانا تا حینِ حیات پیغمبر خدا کے نقش قدم پہ چلتے رہے۔ یہ واقعہ یقیناً سطور بالا میں مذکور واقعہ سے بہت حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ اس واقعہ کے راوی مولینا عبدالشکور صاحب ہیں۔ جو اس وقت دار العلوم تعلیم القرآن راولپنڈی میں شیخ

الحدیث کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں آپ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ہم حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب صدر مدرس کی معیت میں سہارن پور سے کیمبل پور آرہے تھے ہمارے ساتھ کچھ طلبا دورہ تفسیر کے لئے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آرہے تھے ادھر حضرت مولانا احمد علی صاحب دیوبند کے اکابرین کے استقبال کے لئے ریلوے اسٹیشن پر تشریف فرما تھے اتفاق سے یہ لوگ متوقع گاڑی سے نہ آسکے۔ چونکہ طلبا مسجد شیرانوالہ کے مقام سے ناواقف تھے اس لئے مولانا عبدالشکور صاحب نے حضرت مولانا کی خدمت میں ناواقفیت کی بناپر یہ درخواست کی کہ آپ طالب علموں کو حضرت مولانا احمد علی صاحب کے ہاں پہنچادیں حضرت مولانا نے بغیر کسی پس وپیش کے طلبا کا سامان حتی المقدور اٹھاکر مسجد میں پہنچادیا۔ طالب علم یہ دیکھ کر غرق ندامت ہوئے کہ ان طلبا کا ذاتی سامان اٹھانے والا کوئی معمولی باربردار نہیں بلکہ اپنے زمانے کا شیخ التفسیر ہے۔

حضرت اپنے خادموں اور شاگردوں کی کوتاہیوں کو نظرانداز کرنے میں بڑے فیاض تھے عام مشاہدہ کی بات ہے کہ اساتذہ اپنے شاگردوں سے وہ ربط وتعلق قائم رکھنے کے روادار نہیں جس کے وہ بہرحال مستحق ہیں۔ حالانکہ مذہبی اور سماجی نقطہ نگاہ سے اساتذہ اور شاگردوں کے مابین بڑا لطیف ربط وتعلق ہوتا ہے۔ استاد شاگرد کے لئے شفقت اور محبت کا سرچشمہ ہوتا ہے اور شاگرد استاد کی زبان ہوتا ہے یعنی ادب وطاعت شاگرد کی کتاب کا زریں باب ہوتا ہے ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کے بدلتے ہوئے ادوار میں ایک ایسا دور بھی آیا۔ جب کہ اساتذہ شاگردوں کے ساتھ شریک طعام ہونا اپنے لئے مسرت وشادمانی کا پیش خیمہ

سمجھتے تھے اور آج استاد کو اس فعل کے گرد وپیش میں ذلت ورسوائی اور احساس کمتری کا بسیرا نظر آتا ہے۔ راولپنڈی کے ایک نام نہاد خطیب اعظم اپنے شاگردوں سے صرف اس لئے نالاں تھے کہ وہ اپنے اساتذہ کی رفاقت کا دم کیوں بھرتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ میری موجودگی میں مذکورہ خطیب اعظم نے خطابت کے جوش میں اپنے ایک شاگرد کو ڈانٹ پلاتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں تمہیں روٹی کا ٹکڑا نہ دوں تو تم کتوں کی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرو۔ یہ شاگرد زار وقطار رو رہا تھا اسکی آنکھ اشکبار تھی چشم گریاں تھی سینہ بریاں تھا اور آہ سوزاں تھی۔ اس واقعہ کے چند ہی ایام کے بعد خطیب اعظم صاحب کو نہایت ذلت ورسوائی کے ساتھ خطابت عظمے کی مسند جلیلہ سے فطرت نے اتار پھینکا۔ اور اب کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔ وہ شان وشوکت اور رعب طنطنہ گھٹ کر مر گئے ہیں جن پر ایک مدت سے وہ نازاں تھے گردش لیل ونہار نے غرور و تکبر کی تمام آلائشیں چاٹ لی ہیں۔ اور وہ ہیں کہ مشت غبار سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس اعتبار سے بھی مولانا قابل صد احترام ہیں۔ وہ شفقت کی رنگینی و رعنائی سے واقف تھے۔ وہ محبت کا قرینہ رکھتے تھے وہ جذبات کی گرہ کشائی کا فن جانتے تھے۔ افراط وتفریط کا سکہ یہاں چلتا دکھائی نہیں دیتا۔ غیظ وغضب یہاں حرام ہیں۔ غرور وتکبر کا یہاں دم گھٹتا ہے آرائش وزیبائش یہاں نام کو نہیں، خود نمائی کا جذبہ زندہ درگور ہے اس کے برعکس شگفتگی اور دلربائی یہاں کی دولت لازوال ہے چشم پوشی اور کرم فرمائی یہاں کی متاع عزیز ہیں یہ گلہائے عقیدت نہیں جسے کسی کی اندھی عقیدت نے جابجا صفحات کے سینے پر بکھیر دیا ہو بلکہ یہ حقائق و معارف

کے وہ گلہائے رنگا رنگ ہیں جن کی نزہت و خوشبو غیر فانی ہے اور لاثانی بھی۔ شام کا آنچل گر چکا ہے رات کی پلکیں بھیگ رہی ہیں ہر سو فضا ایک روایتی شاہد کی طرح اٹھکھیلیاں کر رہی ہے ماحول مترنم ہے طبیعت ساز گار ہے۔ ہر بلند و پست نیند میں سرشار ہے اتنے میں حضرت مولانا سید شبیر الوالہ کے حجرہ کی جانب چلے آ رہے ہیں حجرہ کے دروازہ پر شیخ التفسیر دستک دے رہا ہے۔ حجرہ کے اندر سے آواز آئی کہ کون ہے، مفسر قرآن بار دگر دستک دیتے ہیں۔ اب حجرہ نشین کی آواز کا لب و لہجہ سخت ہو جاتا ہے حضرت پھر دستک دیتے ہیں۔ اب کی بار حجرہ نشین آپے سے باہر ہے حواس باختہ ہیں ذہن و شعور پہ قابو نہیں۔ جذبات کی تلخی غالب ہے ماحول لرز رہا ہے کانپ رہا ہے لیکن باہر احمد علی شفقت کا کوہ گراں بن کر کھڑا ہے ایک ایسا پہاڑ جس کی سنگینی سے کسی کو خوف نہ ہو بلکہ نرمی اور ملاطفت کے ہیرے جس کی کوکھ سے جنم لیتے ہوں۔ حجرہ نشین حضرت کی اس کمال بے نفسی کو دیکھ کر سخت نادم ہوا لیکن شیخ التفسیر برابر مسکراتا رہا ⁂

پیرِ کامل

حضرت مولانا سادگی کے پیکر تھے۔ سادگی اور شستگی آپ کے خادم تھے وہ اگرچہ پیر تھے لیکن لکیر کے فقیر نہ تھے انھیں دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ پیر ہیں کیونکہ وہ آج کے پیروں جیسی سج دھج کے مالک نہ تھے وہ روایتی کروفر کے قائل نہ تھے جو عہد حاضر کے نام نہاد پیروں کی شخصیت سے مخصوص ہے موجودہ پیر محفلوں کی جان ہیں کلبوں کی آن ہیں اور شاہی مسندوں کی شان ہیں آج کے پیر اپنے سادہ دل مریدوں کے ہجوم میں کچھ اس انداز سے چلتے ہیں جیسے اکبر بادشاہ ابوالفضل اور فیضی کے تبحر علمی سے چشمک زنی کر رہا ہو، ہمارے ہاں پیروں فقیروں کی کمی نہیں، ہم پیروں کے وجود کے مخالف نہیں بلکہ ہمارے نزدیک ان کی رہبری خوش آئند ہے۔ لیکن ایسے پیروں کے خلاف ہماری زبان وبیان کی تلخی میں کمی نہیں آسکتی جو سادہ دل مریدوں کی سادگی کا لہو نچوڑ لیتے ہیں۔ ان کی جہالت سے اپنے تن و توش اور کام و دہن کی لذت بے مایہ کو برقرار رکھتے ہیں ان لوگوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں کہ مرید کی

غربت اور صفائی طینت کس طرح ان کے ہاتھوں زخمی ہو رہی ہے یہ شرافتوں کے لیٹیرے اور عصمتوں کے ڈاکو پیری کا لبادہ اوڑھ کر مریدوں کی سادگی کو فریب دیتے ہیں اور مرید ہیں کہ اپنے پیر کی شان میں ہر گھڑی رطب اللسان نظر آتے ہیں چاہے وہ ان کی عزت و آبرو کو بر سر بازار نیلام کر رہا ہو۔ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ عہد حاضر کے پیروں کے گھر نگار خانے معلوم ہوتے ہیں۔ پیر صاحب پیری کے روپ میں شرافت کی زبان کاٹ دیتے ہیں۔ تقدس کا گریباں چاک اور متانت کے چہرہ کی آب فروخت کرتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ جس قدر نقصان دین مصطفوی کو ان نام نہاد پیروں کی کرامات نے پہنچایا ہے شاید ہی کسی فرد اور گروہ نے اس قدر پہنچایا ہے قیامت کے روز حوض کوثر کے کنارے ساقیٔ کوثر تشریف فرما ہوں گے۔ ادھر سے پیروں کا قافلہ شان دلربائی کے ساتھ آرہا ہوگا۔ محبوب خدا پذیرائی کو بڑھیں گے۔ اس خیال سے کہ شاید اصحابہ رسولؐ آرہے ہیں آسمان سے صدائے ربانی آئے گی:

انک لا تدری ما احدثو بعدک۔

میرے پیغمبر! ان میں ایک بھی ابو بکر صدیق نہیں، کوئی بھی عمر فاروق نہیں کوئی عثمان غنی نہیں اور کوئی شیر خدا نہیں بلکہ یہ وہ ہیں جو آپ کے دین کا تاج محل گرا دینے کے موجب بنے۔

یہ واقعہ ہے کہ موجودہ پیر مریدوں کے لئے وبال جان اور بلائے بے درماں بن کر رہ گئے ہیں پیر امیدوں کا چراغ روشن کرتا ہے اور مرید کی امنگوں کا سرچشمہ ہوتا ہے اس کی کشتِ ویران کو معرفت کی ضیا پاش کرنوں سے منور کرتا ہے

اس کے قلب میں جاگزین اندھیاروں کو نور معرفت کے اجالوں میں بدل دیتا ہے یہاں کذب و افترا دو لغو اور بے معنی الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں یہاں نور شرافت انگڑائیاں لیتا ہے حجاب و متانت نور کے سانچے میں ڈھلتے ہیں حق گوئی اور حق اندیشی تلوار کی تیز دھار بن کر باطل کی رگ کاٹ دیتی ہے یہاں خوف و ہراس کا وجود نہیں۔ ترغیب و تحریص کا یہاں گزر نہیں۔ لیکن کیا کریں کہ موجودہ عہد پیری عجیب رنگ دکھا رہا ہے، خدا کی قسم! اگر ان پیروں کا خبثِ باطن منظرِ عام پر لائیں تو یقین ہے کہ مسجدوں کے چراغ بجھ جائیں، یہ لوگ مریدوں کی گردن پر بار گراں ہیں ان کے کیسۂ تار تار میں سے کھوٹا سکہ تک برآمد کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ علامہ اقبال کے ہاں پنجاب کے ایک نامور پیر تشریف فرما تھے۔ پیر کی تلاش میں مرید باصفا بھی وہیں آن پہونچا۔ مرید نے اپنے پیر کی بارگاہ مقبولیت میں درخواست کی کہ وہ ان کے لیے حضورِ قلب سے دعا کریں، تاکہ وہ قرضہ کی لعنت سے نجات پا سکے۔ کیونکہ وہ پانسو روپے کا مقروض تھا، جاتے جاتے مرید نے ایک روپیہ پیر کی مٹھی میں تھما دیا۔ قریب ہی رمز شناسِ حقیقت علامہ اقبالؒ بھی تشریف فرما تھے آپ کی رگ ظرافت پھڑکی، بیساختہ پکار اٹھے، اے سادہ دل مرید اب ۵۰۰ روپیہ کے لئے نہیں بلکہ ۵۰۱ روپیہ کے لئے دعائے خیر کی درخواست کرو۔ کیونکہ پیر کے ہاں آنے سے قبل تم ۵۰۰ روپے کے مقروض تھے۔ اور جانے کے بعد ۵۰۱ روپیہ کے مقروض ہو گئے۔ یہ اثر و اعجاز ہے پیر کی کرامت کا۔ بس کچھ ایسی ہی کرامت کا ظہور آج کے پیروں کی طرف سے ہوتا ہے نوعمر لڑکیوں کے ہجوم میں پیر صاحب تخت صدارت پر

تشریف فرما ہیں وزدیدہ نگاہی کا مشغلہ جاری ہے یہ حقائق اخبارات کی وساطت سے ہم تک پہونچے ہیں کہ پیر صاحب اپنی تمام تر کرامات کے جلو میں حسینانِ جہاں کے بحث حسن پر اس طرح جلوہ گر ہیں کہ بے ساختہ اقبال کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا،
گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب

لیکن حضرت مولانا شرم وحیا کے مجسمہ تھے حجاب ومتانت آپ کے گرد ہالہ کئے ہوئے تھے۔ مردوزن دونوں کے روبرو آپ کی شرافت سے بھرپور آنکھ جھکی رہتی تھی۔ کیا مجال آنکھ میں آنکھ ڈال کر مردوزن سے مخاطب ہوتے۔ اس لئے کہ حیا غالب تھی۔ پیر ہو تو ایسا ہو، ہم ایسے باحیا پیروں کے قدم چوم لینے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ کون ہے جو بایزید بسطامیؒ کے نام نامی اور اسم گرامی سے واقف نہ ہو۔ جب تک ولایت کی تاریخ زندہ ہے یقیناً اس وقت تک بایزید زندہ ہیں یہ اپنے دور کے ابدال تھے۔ پیر لازوال تھے۔ بے حیا زندی آئے تو اس پیر کی نگاہ کرم سے بے حیائی کا داغ مٹ جائے اور نادرۂ روزگار قرار پائے۔ اس کی بارگاہ میں جہاں حسن کے ڈاکو آتے ہیں اب فیضان علم وعرفان کے جویا ہجوم درہجوم آنے لگے۔ ہاں ہاں اسی پیر باتدبیر کی بات کرتا ہوں، اس کا مرید صفائی قلب کے ساتھ اپنے پیر کی حریم ناز میں در آتا ہے ساتھ اپنی شرافت مآب بیگم کو بھی لاتا ہے سلوک ومعرفت کی منازل طے ہوتی ہیں ایک روز مرید کی بیوی حنائی ہاتھ کی الھڑ شوخیاں لئے اپنے پیر کی خدمت میں

بیٹھی ہے پیر نے ناصحانہ انداز میں محترمہ کے دست حنائی کی جانب اشارہ کیا۔ مرید کی باحیا بیگم یہ کہہ کر مجلس پیر سے رخصت ہوئی کہ اب ہمارا اس بزم خیر میں تا دیر قیام ممکن نہیں کیونکہ اب تو ہمارے پیر کو ہمارے ہاتھ کی رنگینی نظر آنے لگی ہے۔ اس واقعہ کی موجودگی میں عہد حاضر کے پیران بے پر کے پاس اپنی پیری کا کیا جواز باقی رہتا ہے اور خانقاہوں کے مجاوروں کو کیا حق پہونچتا ہے، کہ وہ سادہ لوح مریدوں کو قطار اندر قطار مزار پر نچاتے پھریں، اللہ کا احسان ہے کہ حضرت مولانا واقعی پیر تھے جن پہ پیری ناز کر سکے۔ آپ کی آنکھ ہمیشہ جھکی رہتی۔ مجھے کئی بار حاضر خدمت ہونے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کبھی اور ہرگز کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ آپ نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مخاطب کیا ہو، بلکہ یہاں عالم ہی نرالا ہے، چہرہ مبارک پہ شرافت مچل رہی ہے آنکھوں میں نورِ ایمان اور حیائے عثمان کی جھلکیاں ہیں۔ چال میں فرشتوں کا لوچ ہے۔ ماتھے پہ نورِ فطرت جگمگا رہا ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ہمارے فاضل دوست حضرت مولانا علیہ الرحمۃ صاحب انور بھی اپنے باپ کی ہو بہو تصویر ہیں۔ اس تصویر کا کوئی رنگ پھیکا نہیں اور کوئی نقش باطل نہیں بلکہ وہی شرافت اور حجاب و متانت ہے جو باپ فطرت سے وراثت کے طور پر لایا تھا۔

جہاں تک سادگی کا تعلق ہے وہ بھی حضرت کی زندگی کا طرۂ امتیاز ہے نورانی چہرہ پہ سادہ لباس کی سادگی عجب بہار دیتی تھی، تصنع اور تکلف سے آپ کی فطرت عاری تھی یہ بھی ممکن نہ تھا کہ خدام کے ہجوم میں خسروانہ شان سے مریدوں کے ہاں فروکش ہوں۔ بلکہ آپ کی سادگی ہی سب سے بڑا حسن تھا اس

حسن جہاں تاب کے سامنے سارا حسن ماند ہے اور یہی حسن ہے جو ہر کہ ومہ کو آپکا گرویدہ اور والا وشیدا بنا دیتا ہے، امراو سلاطین کی دعوتوں میں شریک ہونے سے برابر کنی کتراتے رہتے۔ لیکن جب بھی شرکت فرما ہونے کا موقع ملا۔ حضرت نے اپنی سادگی کو کسی صورت بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایک دفعہ نواب بہاولپور کی دعوت پر بہاولپور تشریف لے گئے۔ نواب صاحب کی طرف سے استقبال کے لئے وزیر اعظم بمعہ عملہ ریلوے سٹیشن پر حاضر خدمت تھے۔ حضرت پلیٹ فارم پر اترے، تو آپ کے ہاتھ میں چمڑے کا ایک مصلّٰی تھا جس میں بعض ضروری سامان تھا۔ وزیر اعظم نے حیرت و استعجاب کے عالم میں دریافت کیا کہ آپ تن تنہا ہیں آپ کا سامان اور خدّام کہاں ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔

"میرا سامان میرے ہاتھ میں ہے میرا خادم میرے ہاتھ اور پیر ہیں۔

حضرت کا یہ سادہ سا جواب سن کر وزیر اعظم سکتے کے عالم میں محو ہو گئے۔ وزیر اعظم کی حیرانی بعید از قیاس نہیں اس لئے کہ آج کے پیروں میں خود نمائی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ پیر صاحب توند نکالے گھنگھریالے بالوں کی لٹ فضا میں لہرا کر خدام کی فوج ظفر موج کے ہجوم میں پہلوانوں کی طرح اکڑ کر چلتے ہیں لیکن حضرت مولانا کے ہاں یہ بات نہیں۔ یہاں سادگی اور منکسر مزاجی اپنی پوری شان سے براجمان ہے آپ کے پہلو میں ایک مونس وغم خوار کا دل تھا جو قوم کی پستیٔ افکار پر ہر وقت اداس رہتا تھا۔ آپ کو انسانیت سے سچی ہمدردی تھی اسی جذبہ کے تحت آپ انسانیت کی تادم آخر خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے جب ہم موجودہ پیروں کی واردات کا ایک چابکدست فنکار کی طرح تحقیقی تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں

حضرت مولانا نہایت اونچی مسند پر جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ پاکستانی پیروں کو اپنے کام و دہن کی لذت سے سروکار رہتا ہے وہ اپنی تجوریوں کو سیم و زر اور لعل و گوہر سے بھرپور چاہتے ہیں چاہے مرید کسی سلطان کے گھر ڈاکہ ڈال کر مال و زر کا انبار لائے انھیں جائز و ناجائز اور حرام و حلال سے کوئی نسبت نہیں صرف ایک دھن ہے جو پاکستانی پیروں کے قلب و جگر کی وسعتوں اور پہنائیوں میں رقص فرما ہے اور وہ ہے زر اندوزی کی ہوس، اس ہوس کی تسکین کے لئے یہ لوگ ہر ممکن اور غیر ممکن حربہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا سخی تھے ایک ایسا سخی جس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہ ہو۔ انجمن خدام الدین کے لاکھوں کے سرمایہ کا امیر ہونے کے باوجود خود کو ایک پائی تک خرچ کرنے کا روادار نہ گردانتا ہو۔ سفر و حضر اور نشست و برخاست غرض کہ ہر کروٹ پر آپ کو سخاوت کا ایک رنگ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ حاجی دین محمد صاحب کا بیان ہے کہ ایک بار آپ کو حضرت کے ساتھ شریک سفر ہونے کا اتفاق ہوا۔ منٹگمری پہنچ کر حاجی صاحب نے چار سیر کھجوریں دو سیر سنگترے خرید کر حضرت کی خدمت میں پیش کئے حضرت نے نہایت شفقت اور مہربانی سے فرمایا کہ اس پھل کو تمام مسافروں میں تقسیم کر دو اس دو سیر پھل میں سے آپ نے اپنے لئے صرف دو کھجوریں رکھ لیں باقی پھل تمام مسافروں میں بانٹ دیئے۔ یہ آپ کی وسعت قلبی کی روشن دلیل ہے اگر کوئی اور پیر ہوتا تو سارا مال گھر پہنچانے کا اہتمام کرتا۔ لیکن حضرت کی فیاض طبیعت کو یہ گوارا نہ ہوا آپ انسانوں کے علاوہ جانوروں پر بھی برابر مہربان تھے ایک بار کسی جگہ لاہور سے باہر آپکو تقریر کی غرض سے جانا تھا اسٹیشن پر پہونچ کر آپ کو یاد آیا، کہ

ایک چڑیا آپ کے حجرہ میں بند ہے چونکہ حجرہ کے تمام دروازے بند تھے اس لئے آپ نے منتظمین جلسہ کو فوراً تار بھیج دیا کہ وہ دوسری گاڑی سے آ رہے ہیں۔ یہ طرز عمل سنت نبوی کے عین مطابق ہے۔ پیغمبر خدا کھیت کے پاس سے گزر رہے ہیں ایک اونٹ بھاگتا ہوا آیا اور دوش رسول پر سر رکھ کر اپنا دکھ درد بیان کیا۔ جانوروں کی بولی سمجھنے والا پیغمبر اونٹ کے مالک کو بلا کر یوں گویا ہوا۔ اونٹ شکایت کرتا ہے کہ تو اس سے کام زیادہ لیتا ہے لیکن چارہ کم دیتا ہے۔ اس پر مہربانی فرمایا کرو۔" یقیناً حضرت مولانا کا ہر قدم رسول ہاشمی کے نقش قدم کے عین مطابق اٹھتا رہا۔ اور ہمارے نزدیک جو اتباع سنت کرتا ہے وہ ولیٔ کامل ہے اس لحاظ سے حضرت مولانا یقیناً ولیٔ کامل ہیں ؎

حق گوئی و بیباکی

ہم متعدد مقامات پر اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کر چکے ہیں کہ حضرت مولانا فی سبیل اللہ فساد کے قائل نہ تھے وہ گھپلا بازی اور خواہ مخواہ کی پچ پچ میں نہ خود الجھتے تھے، نہ دوسروں کو الجھانا مناسب خیال کرتے تھے سلامت طبع اور اعتدال مزاج آپ کی فطرت کا جوہر زرنگار ہے غالباً یہی وہ خوبی ہے جس کی بنا پر ہر کہ ومہ اور ہر کس و ناکس آپ کا والہ و شیدا نظر آتا ہے۔ یہ طے شدہ بات ہے کہ حضرت لاہوری میانہ روی کے دلدادہ تھے لیکن یہاں ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز کرنے کی غلطی نہ کرنی چاہیئے، کہ حضرت مولانا جادۂ اعتدال پر گامزن ہونے کے باوجود حق گوئی اور حق اندیشی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ آپ کا مشاہدہ عمیق تھا۔ اس لئے آپ کی عقابی نگاہوں سے کسی حقیقت کی جزئیات تک کا اوجھل ہونا ممکن نہ تھا۔ علاوہ ازیں جس بات کو سچ جانا، اس کی آبرو محفوظ کرنے میں حضرت مولانا سر دھڑ کی بازی لگا دینے سے بھی گریز نہ کرتے، بلاشبہ

یہ ایک قابل فخر جوہر شخصیت ہے اسی سے شخصیت کے جملہ عناصر نشو و نما پاتے ہیں۔ خصوصاً اس دور میں تو حق گوئی ایک گوہر نایاب ہے کیونکہ آج ہر سو خود بینوں اور مصلحت اندیشوں کا ہجوم بے پایاں نظر آتا ہے۔ ہمارے نزدیک مصلحت بین خطیب و ادیب سے وہ شرابی ہزار درجہ بہتر ہے جو شراب کے نشہ میں سچی بات تو کہہ دیتا ہے ؎

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

تاریخی واقعات و حقائق شاہد ہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں مصلحت بینوں کے فرقہ ہائے باطلہ نے حق گوئی کے چہرے کو مسخ کر دیا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ حق ہر دور میں زندہ رہا۔ چاہے اسے زندہ در گور کرنے کے لئے وقت کے طالع آزماؤں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ حق کی آواز وقتی طور پر تو دبائی جاسکتی ہے لیکن ابدی زندگی کے خوش گوار لمحات حق کے مقدر میں رقم کئے جا چکے ہیں یہاں تک کہ آتش نمرود کے شعلے بھی حق و صداقت کی لطافتوں کو چاٹ نہ سکے بلکہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بھی حق بآواز بلند یوں گویا ہوا ؎

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں، نہیں دانۂ اسپند

کربلا کی سنگلاخ زمین اپنی تمام تر درشتی و سختی کے باوجود حق کے علم کو سرنگوں نہ کرسکی۔ یزید کی یزیدیت آج بھی نگوں سار اور شرم سار ہے۔

کہ وہ مکروفریب اور شاطرانہ چالوں کے باوجود بھی حق کو مٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بلکہ حسینؑ کا کٹا ہوا سر، علی اکبرؓ کے رگوں سے بہتا ہوا خون اور جوان رعنا کی پنڈلی سے بچڑا ہوا لہو یہ نعرہ حق بلند کرتا ہوا غلغلہ انداز ہوا ؎

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

لیکن ایسے لوگ معدودے چند ہوا کرتے ہیں اور ان کا وجود تقریباً ناپید ہے۔ جو حق وصداقت کی خاطر زندگی تک کو تصدق ونثار کرنے کے لئے بے قرار ہوں۔ یہاں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ذاتی منفعت کی بنا پر فتوائے حرام جاری کرنے سے بھی پہلو تہی کرتے نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ان حضرات کے پیش نظر صرف ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ اور اس کے حصول کی خاطر وہ سب کچھ فروخت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ تاریخ کا سینہ چاک کرنے سے بہت سے سربستہ رازوں کا انکشاف ممکن ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ کے ایک دور میں ایک ایسا وقت بھی آیا۔ جب ہمارے پیروں اور واعظوں نے خانہ کعبہ کے در و دیوار کو چھلنی کرنے کے لئے تعویذ کی شمشیر تاب دار دے دی۔ اور یوں مبالغہ آرائی کی کہ اس تعویذ کی مدد سے آپ دشمنوں کی تلوار کی زد سے محفوظ رہیں گے۔ اور دشمن گاجر مولی کی طرح کٹ کر رہ جائیگا اس قسم کی فریب کاریوں سے تاریخ عالم کے صفحات بھرے پڑے ہیں جن میں ہمارے نام نہاد واعظوں نے بدکرداری کا کردار ادا کیا ہے۔ میرے نزدیک حق فروش ملّا سے وہ زندگی بہتر ہے جو چند فاقوں کو بھلانے کے لئے

اپنی چادر عصمت کا سودا کرتی ہے۔ لیکن ان واعظان ناعاقبت اندیش کی طرح پوری قوم کی چادر عصمت فروخت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی ؎

تو نے عصمت فروخت کی ہے فقط
ایک فاقہ کو ٹالنے کے لئے

لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں
اپنا مطلب نکالنے کے لئے

عہد حاضر میں بھی ایسے واعظوں کی کمی نہیں جن کی ہر تقریر کا ہر جملہ جبیں شاہی کے بل پر رقص فرما نہ ہوتا ہو۔ ہم انتہائی یقین و وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ننانوے فیصد واعظ امراء و سلاطین کی حریم ناز پر ناصیہ فرسائی کرتے دکھائی دیتے ہیں ان کا ضمیر اور ان کی آواز شاہی خزانوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے۔ یہ لوگ ننگ دیں، ننگ قوم اور ننگ وطن ہیں جنہیں میر جعفر، امیر صادق، ابولہب اور ابوجہل کی پلید مٹی نے جنم دیا ہے۔

ہم انتہائی انکسار سے معذرت خواہ ہیں کہ ہماری زبان قلم کس قدر گستاخ و بے ادب ہے جو واعظوں کی شان والا تبار کے حضور میں گستاخی و بیباکی سے تڑاق پڑاق چلتی رہتی ہے لیکن کیا کریں حقیقت یہی ہے اور حقیقت سے روگردانی ہمارے بس کی بات نہیں ہمیں اپنی گستاخی پر ناز ہے بلکہ یوں کہیئے ؎

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

ہم علمارِ حق کی بارگاہ عظمت میں اونچی آواز سے بات کرنا بھی سُوِ ادب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارا ایمان و ایقان ہے کہ اس قسم کے بزرگوں کی بدولت ہی اسلام کا تاج محل اپنی پوری شان اور سج دھج سے قائم و دائم ہے اگرچہ علمارِ سور کے پلید گروہ نے بارہا اس محل کی شان دلربائی کو زخمی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لحاظ سے ہم حضرت مولانا لاہوری رح کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ آپ نے اعتدال مزاج کے باوجود حق گوئی، حق بینی اور حق اندیشی کو کسی وقت بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ یہ وہ مردِ حق آگاہ تھا جس کی آواز سے فضائیں کانپ جاتی تھیں محلات لرزہ براندام ہوتے تھے۔ کلاہ شاہی کے پیچ ڈھیلے ہو جاتے تھے — اور شہنشاہوں کے گریبان غریبوں اور ناداروں کے قہقہوں کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے تھے۔

وہ غریبوں کا حامی تھا۔ پریشان حالوں کا مددگار اور غرورِ شاہی کو پاؤں تلے روند دینے کا فن جانتا تھا۔ یہ مردِ حق آگاہ ایک طرف تو درویشوں کے جوتے سیدھے کرتا ہے اور دوسری طرف گورنر پنجاب سردار عبدالرب نشتر کو یوں مخاطب کرتا ہے:

"اے نشتر! تو پاگل، تیری قوم پاگل، یہ جہان پاگلوں کا، اپنی دیوانگی کا علاج کراؤ، تمہاری دیوانگی کا علاج MENTAL HOSPITAL میں نہیں بلکہ قرآن کے سیپاروں میں ہے، اسے پڑھو، سمجھو اور اپنی دیوانگی کا علاج کرو۔ اگر خود نہیں پڑھ سکتے تو میری خدمات حاضر ہیں، اپنے خرچ پر آؤں گا۔ اپنے خرچ

جاؤں گا۔ تمہارے گھر کا کھانا حرام سمجھتا ہوں، تمہاری مصروفیات کے پیش نظر صرف دس منٹ لوں گا۔ اور اس مختصر سی مدت میں پاکستان کا وہ نقشہ مرتب کر دوں گا کہ ایک عالم ورطۂ حیرت میں ڈوب جائے گا۔"

کیا یہ باتیں کسی مسجد کے ملاّ کی ہیں کسی گدائے راہ کی ہیں کسی وزیر با تدبیر کی ہیں؟ نہیں نہیں! یہ باتیں کسی مسجد کا کوئی ملاّ نہیں کہہ سکتا۔ اور نہ کوئی امیر و وزیر کہنے کا یارا رکھتا ہے صاف ظاہر ہے کہ یہ باتیں کسی مرد درویش کی ہیں احمد علی کے علاوہ یہ مرد درویش کون ہو سکتا ہے؟

بے غرضی

عہد حاضر میں سچی بات کہنا تلوار کی تیز دھار پہ چلنے کے مترادف ہے۔ بلکہ اغلباً یہ کہنا بجا ہے کہ تلوار کی تیز دھار پہ چلنا آسان ہے لیکن حق وصداقت کا اظہار و ابلاغ مشکل ہے۔ کیونکہ آئے دن کے واقعات وحقائق کچھ ایسے ہی تجربات ومشاہدات کو جنم دیتے ہیں جو مذکورہ بالا بیان کی پختگی میں مدد دیتے ہیں۔ آئین اخلاق کا اولین اصول یہ ہے کہ حق گو ہر قسم کی ترغیب و تحریص اور خوف وہراس سے بے نیاز ہو، دولت کی پاسداری کا خیال اور حکمران کی حکمرانی کا احساس خاطر میں نہ لانے والا ہو۔ اگر حق گو ان عوامل کی زد میں آگیا تو جان لیں کہ حق وصداقت کا خون ہو گیا۔ نواب زادوں اور حکمرانوں کے ٹولوں سے حمایت حق کی توقع یقیناً عبث ہے کیوں کہ ان کی شان نوابی اور قصر حکومت کا جاہ وجلال کذب وافترا اور فریب وبطلان کے سہارے ہی زندہ ہیں لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں سے حق گوئی کی

توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ وہ بھی عملاً سخت ترین بد دلی اور مایوسی سے ہم کنار کرتے ہیں، ان لوگوں سے مراد وقت کے واعظوں اور پیروں سے ہے جو اپنی دو رنگی سے حق کا پر رونق چہرہ ویران کرنے میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں حالانکہ حق کی آبرو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں میں محفوظ ہو سکتی ہے۔ لیکن جس چمن کا مالی ہی چمن کا حسن زخمی کرنے پر تلا ہوا ہو۔ اس باغ کے گل بوٹوں اور کشادہ روشوں کی ماتم گساری اور نوا سنجی کا کیا گلہ۔

عام مشاہدہ کی بات ہے کہ ہمارے واعظوں اور پیروں نے روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض حق گوئی کو پس پُشت ڈال دیا۔ حق کا چہرہ مسخ کر دیا۔ اور باطل کی حریم ناز پہ جبینِ نیاز جھکانے لگے۔ ہم نے محلہ کی مساجد کے اکثر ائمہ کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد و نظریات کا اعلان عام کرنے سے برابر کنی کتراتے ہیں، ظاہر ہے کہ جس شخص کے ظاہر و باطن میں تطبیق نہ ہو، وہ عوام کو سوائے منافقت کے اور کیا دے سکتا ہے ہمیں اکثر و بیشتر واعظوں کے ہمراہ مذہبی جلسوں کو خطاب کرنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن بخدا ہمیں یہ حروف سپرد قلم کرتے وقت شرم محسوس ہوتی ہے کہ یہ واعظان شیریں بیان شہد کو زہر اور زہر کو شکر کہنے کے عادی ہیں۔ دل کی بات کہنا ان کے بس کی بات نہیں۔ حق و باطل کی آمیزش سے کام لینا ان کا شیوۂ بیان ہے راولپنڈی کے ایک خطیب کے ہمراہ مجھے مورگاہ میں معراج النبی کے موضوع پر تقریر کرنے کا اتفاق ہوا۔ راقم الحروف نے اپنے عقاید و نظریات کی روشنی میں پیش نظر موضوع پر پر جوش لہجہ میں تقریر کی۔ کوئی ایسی بات نہ

تھی جو ہمارے نظریات سے متصادم ہوتی ہو، صاف صاف ہر بات کا اعلان کیا گیا۔ اور عوام تھے کہ وفورِ جوش سے نعرۂ تحسین بلند کر رہے تھے لیکن جب ہمارے رفیق رہ منزل کی باری آئی تو آپ نے اپنی مخصوص راہ نظریات سے ہٹ کر وہ راہ اختیار کی جو ضمیر فروش مولویوں کا ایک مخصوص طائفہ اپنے لئے متعین کر چکا ہے۔ افسوس کہ ہمارے خطیب کو گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے کے باوجود بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ علمار کا ایک اور گروہ مذہب کی بستی میں چور دروازے سے در آیا ہے — ان مولویوں کا ارشاد ہے۔ کہ مذہب میں اس قدر لچک پیدا کرو کہ وہ مقتضیات حیات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ یہ معمولی قسم کے لوگ نہیں بلکہ یہ بزعم خود علامہ دوراں ہیں۔ اگر آپ انھیں مولوی صاحب یا مولانا کہہ دیں تو یہ علامہ صاحب اس طرح ناک بھوں چڑھاتے دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی لفنگے نے کسی مغلظ گالی کی ایک موٹی سی سل لڑھکا دی ہو۔ حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنے اندر لچک پیدا کریں۔ تاکہ قرآن مجید اور فرقان حمید کے اٹل قوانین سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ لیکن ارشاد ہوتا ہے کہ مذہب کے اندر لچک پیدا کرو۔ اور اس طرح لچک پیدا کرو کہ مذہب کا نام و نشان تک باقی نہ رہے اور صرف لچک اور ٹلک باقی رہ جائے جس کے جھولے میں یہ واعظانِ ناعاقبت اندیش بدمستی کی نیند کے مزے لیتے رہیں۔ آخر یہ صورتِ حال پیدا کیونکر ہوئی۔ علما کیوں یہ نعرہ بلند کرنے لگے کہ دینِ اسلام میں لچک پیدا کرو۔ اگر سچ پوچھیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ دین پادشاہی ہے حکمرانوں کا مذہب بھی یہی ہے جسے

آج کے موقعہ پرست علمار نے اپنا لیا ہے۔ یعنی دین میں لچک پیدا کر دو۔

ان تصریحات کی روشنی میں یہ حقیقت واضح طور پر بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کہ حق گوئی کوئی معمولی بات نہیں۔ یہاں ایمان کے سودے ہوتے ہیں۔ ضمیر بکتے ہیں۔ قرآن کو مصلحتوں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے۔ حقائق فروخت ہوتے ہیں۔ قلب ونظر کی رعنائی نیلام ہوتی ہے۔ حق گو کے لئے ضروری ہے کہ وہ جذبات کی صحت مندی، عقیدہ کی پختگی، خیال کی رعنائی، احساس کی برنائی اور انتہائے مقصود سے سچی لگن اور تڑپ پیدا کرے۔ یہی وہ عوامل ہیں، جن سے حق گوئی کا تاج محل تعمیر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اسی قسم کے اوصاف سے متصف تھے جبھی تو آپ کی طبیعت ہر قسم کے خوف وہراس سے آزاد تھی۔ امیر وسلطان آپ کے باجگذار تھے، خاکسار تحریک کے زمانہ عروج میں حکومت وقت نے بانیٔ تحریک کے خلاف فتوئے جاری کرانے کی مہم کا آغاز کیا۔ حکومت بہت حد تک کامیاب رہی۔ اگرچہ حضرت مولانا کو بانی تحریک کے بارے میں دیگر علمار کے نظریات سے کامل اتفاق تھا۔ تاہم آپ حکومت کے کہنے پر تکفیر کی شمشیر کا وار کرنے کے حق میں نہ تھے ہزار اختلافات کے باوجود آپ خاکسار تحریک کی عسکری افادیت کو نظر انداز کرنے اور حکومت کے آگے جھکنے پر رضامند نہ ہوئے بہرحال اس وقت کے وزیر اعظم نے آپ کو چائے کی دعوت پر مدعو کیا تاکہ حضرت مولانا کو پھسلا کر کفر کا فتوئے لے لیا جائے حضرت مولانا حق گو اور حق پرست تھے آپ وزیر اعظم کے جھانسے میں آنے کی بجائے بے ساختہ پکار اٹھے ؎

ساقی تیری نگاہ کو پہچانتا ہوں میں
مجھ سے فریب ساغر دینا نہ چاہیئے

نثر کی زبان میں یوں کہیئے " وزیر اعظم ہوش میں آؤ۔ تم چائے کی ایک پیالی پہ احمد علی کا ایمان خریدنا چاہتے ہو" حق گوئی کے اس جرم کی پاداش میں آپ کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ آپ نے سنت یوسفی کا خیر مقدم کیا لیکن صداقت کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

مصلحت کیشی اور عشقِ حقیقی

حق و صداقت وہ انمول ہیرے ہیں جو سچی لگن اور صادق تڑپ کی کان سے جنم لیتے ہیں سچائی اور راست بازی غمِ امروز و فردا سے بے نیاز ہے۔ صداقت و عدالت نتائج و عواقب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ اس کا بیج کبھی اور ہرگز کبھی شرمندہ محنت دہقان نہیں ہوا۔ وہ خود ہی پھوٹتا ہے اور اپنی نشو و نما کے لئے خود اپنے اندر آبِ حیات رکھتا ہے۔ اس نکتہ کی صراحت فرماتے ہوئے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد یوں رقمطراز ہیں:

"اگر حق کا بیج آپ کے دامن میں ہے تو زمین کے سپرد کر دیجئے، اور ہو سکے تو اپنے خون کے دو چار قطرے بھی اس پر چھڑک دیجئے کہ یہی اس کے لئے آب پاشی ہے۔ اس کے بعد آپ کا فرض ختم ہو گیا۔ اب وہ حق نواز اور صداقت پرور اپنے کھیت کی خود نگرانی کرے گا۔ جو اب بھی ویسا ہی نگرانی کرنے والا ہے جیسا کہ ہمیشہ رہا ہے۔"

بلاشبہ حق گرم گرم لہو کے چھینٹے چاہتا ہے۔ اسے شعلے کی لپک اور لہو کی دھار درکار ہے۔ دجلہ و فرات کی مچلتی ہوئی لہروں کا ارتعاش زیریں حق کی متاع عزیز ہے۔ اینٹوں اور پتھروں کی بھرمار میں حق مسکراتا ہے خندہ زن ہوتا ہے۔ مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتا جب کسی حق گو کے قلب و جگر کی وسعتوں اور پہنائیوں سے لہو کی بوندیں رس رس کر حق کی زمین کو سیراب کرتی ہیں تو حق کا عارض گلگوں کس قدر شوخ اور بے باک ہو جاتا ہے آتش نمرود کے شعلے ہوں یا سرزمین کربلا کی ہولناکی۔ حق ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنا یہی مقولہ دہراتا ہے، آپ سے کس نے منت کی تھی کہ آگ سے کھیلیے؛ انگاروں کو مٹھی میں لینے کا دعوےٰ ہے تو آبلہ پڑنے کی شکایت کیوں؛ رعبت پرستوں اور عیش کوشوں کو چاہیئے کہ کانٹوں پر چل کر پاؤں چھلنے کی شکایت نہ کریں کیوں کہ یہاں ؏

سر جاتا ہے گام اولین پر

ہمارے ہاں مصلحت بینوں کا اژدہام ہے وہ حق و باطل کے درمیان مفاہمت کی ایک نئی راہ تلاش کرنے میں پیش پیش ہیں یہ لوگ یا تو دجل و بطلان کی دلفریبی سے مرعوب ہو گئے یا مصیبتوں اور آزمائشوں کے کوہ گراں کی ہیبت سے لرز گئے، نفس خادع جو ہمیشہ ایسے موقعوں کی تاک میں رہتا ہے اب بولنے لگا ہے اور ضعف ایمانی دھوکا دیتا ہے کہ اس میں ہرج ہی کیا ہے؛ آخر وقت و مصلحت بھی تو کوئی چیز ہے؛ دین اسلام میں اس مصلحت کا کوئی مقام نہیں، اگر مصلحت وقت کوئی درنی اور کار آمد شے

ہوتی تو پیغمبر اسلام کیوں لہولہان ہوتے غلیظ گالیوں کی غلاظت کو گوارا کرتے اپنوں اور بیگانوں کو دشمن جان بنا لیتے۔ اگر حضور موقع پرست ہوتے تو اس نادر موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ جب کہ بعض کفار نہایت انکساری کے عالم میں بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر یوں عرض کناں ہوئے۔

"اے محمد ابن عبداللہ، آپ جو چاہیں کریں اور جو چاہیں کہیں، صرف ہمارے بتوں کو برا بھلا کہنے سے گریز کریں، اس کے عوض میں ہم آپ کو نہ صرف مالا مال کر دیں گے، بلکہ حجاز کا بادشاہ تسلیم کرنے میں بھی تامل سے کام نہ لیں گے۔"

مصلحت کیشوں اور موقع پرستوں کے لئے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے، لیکن رسول گرامی مصلحتوں کی قبا چاک کر کے بآواز بلند اور ببانگ دہل یوں فرمانے لگے۔

"اے ساکنان حجاز، اگر تم آسمان کی چھاتی سے آفتاب و ماہتاب توڑ کر میرے حوالے کر دو تو بھی رسول خدا حق کا دامن چھوڑ نہیں سکتا۔"

حضرت ابوطالب کی رہائش گاہ پر امرائے قریش نے داعی اسلام سے کہا کہ وہ سب کچھ کہیں، لیکن ان کے الہٰوں یعنی بتوں کو برا نہ کہیں، حدیث بخاری میں وارد ہے کہ حضرت ابوطالب نے امرا قریش کی اس درخواست پر اس سفارشی جملہ کا اضافہ کیا۔ "اس میں ہرج بھی کیا ہے اگر آپ ان کے بتوں کو برا کہنا چھوڑ دیں" بلاشبہ حضرت ابوطالب کے دل میں اپنے بھتیجا کے لئے بے پناہ محبت تھی۔ جنون و وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ بھتیجے کی معمولی تکلیف پر بھی آپ کے دل میں درد کا سیلاب امنڈ آتا۔ لیکن بایں ہمہ محبت کی اس ہمہ گیری کے باوجود حضرت ابوطالب کے

ہاں وہ قوت ایمانی نہ تھی جو سچائی کی راہ میں دکھ اٹھانے کی ہمت سے ہمکنار کرتی ہے

ے
مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پہ حرام
تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفٰے!
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق امیر جنود عشق فقیہہ حرم
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

یہی وہ جذبۂ عشق ہے جو کبھی آگ کے شعلوں سے آنکھ مچولی کرتا ہے اور کبھی جلال زینب اور چادر زہرا کا روپ دھار لیتا ہے اور جب کبھی موج میں آتا ہے تو حسینوں کا خون رنگین کربلا کی سختی اور درشتی کے حوالے کرکے فاتحانہ قہقہہ بلند کرتا ہے یقیناً حق گوئی کو اسی جوش و ولولہ کی حاجت ہے اس کے بغیر حق گوئی کا نام لینا گناہ ہے، ایک ایسا گناہ جسے فطرت بھی معاف کرنا گوارا نہیں کرتی، اسی جوش و ولولہ کی مہک ہمیں حضرت مولانا کے ہاں نظر آتی ہے

آپ کا عشق بلا خیز کسی مصلحت وقت کا دریوزہ گر نہ تھا۔ بلکہ یہاں مصلحتِ وقت کا دامن تار تار رہے حضرت مولانا مصلحتوں کی قبا چاک کر کے اس کے ٹکڑوں پر قہقہہ زن ہونے میں فخر محسوس کرتے تھے، دنیا کی کوئی مصلحت آپ کے قصر عزائم کو منہدم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ تامین حیات حق کے علمبردار رہے اور باطل کی نگہ ناز سے مسحور نہ ہو سکے۔ توپ و تفنگ اور خشت و سنگ آپ کو جادۂ حق سے گمراہ نہ کر سکے۔ آلام و مصائب کا ایک ہجوم آیا۔ زنجیروں کی جھنکار سنائی دی ترغیب و تحریص کے جال بچھائے گئے۔ مگر یہ بندۂ آزاد کسی دام فریب میں نہ آسکا ہم نے یہ چند جملے بے ترتیبی سے سینہ قرطاس پر بکھیر دیئے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھو، اِن کا مطلب کیا ہے؛ حاصل کلام یہ ہے کہ وہ پہلو میں اپنا دل اور اپنا ضمیر رکھتے تھے اپنا دماغ اور اپنا حافظہ رکھتے تھے ایسا دل اور ایسا ضمیر جو قرآن و سنت کے نور سے زندگی بھر کسب ضیا کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے دل اور ضمیر کو کبھی دھوکا نہیں دیا آپ کی ہر بات ضمیر کی صدائے بازگشت تھی اور اسے ہی عرف عام میں حق گوئی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

جذبۂ شہادت

پچھلے صفحات میں حضرت مولانا کی ملکی اور علمی خدمات جلیلہ کا فنی تجزیہ کرنے کے لئے قلم اٹھایا تھا لیکن افسوس سارا زور قلم تمہید کی نذر ہو کر رہ گیا۔ لیکن کیا کریں موضوع سخن کی گہرائی اور گیرائی وسعت بیابان کی طلب گار ہے۔ حق تو یہ ہے کہ مولانا نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر حق و صداقت کا اظہار و ابلاغ کرنے کے عادی تھے۔ آپ کی حق گوئی محلات کی بلندیوں سے مرعوب نہ ہو سکی۔ اور نہ ہی خسروانہ شان و شوکت اور امیرانہ جلالت و سطوت آپ سے صاف گوئی کی نعمت غیر مترقبہ چھین سکے۔ حضرت رح برابر اظہار حق فرماتے رہے، کسی کے ماتھے کا بل اور کسی قانون کی سختی آپ کو جادۂ حق سے منحرف نہ کر سکی۔ بلکہ آپ آزاد فضاؤں اور جیل کے سرد خانوں میں بھی یہی اور صرف یہی نعرۂ حق بلند کرتے رہے ؎

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

اسی خطا سے عتاب ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں آل سکندری کیا ہے

عہد شباب سختیوں کو اپنی بے نیازی کی چکّی میں پیس دیتا ہے۔ جوانی آلام و مصائب کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتی ہے۔ لیکن بڑھاپے کا زمانہ شیروں کو بھی روباہ کا مزاج عطا کرتا ہے، کمر میں خم آجاتا ہے۔ حافظہ روٹھ جاتا ہے۔ فہم و ادراک اور عقل و شعور ایک قصۂ پارینہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اعضا کا تناسب ٹوٹ جاتا ہے۔ الفاظ کا طلسم مفقود ہو جاتا ہے ۔۔ غرض پوری کی پوری شخصیت ایک داستان عبرت بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن حضرت مولانا کا بڑھاپا جوانی سے چشمک زنی کرتا ہے یہاں بڑھاپا شہ زور جوانوں سے زیادہ پرجوش اور ولولہ انگیز ہے۔ تلوار کی تیز دھار اور نوک سناں اس بڑھاپے کو خوف زدہ نہ کر سکے۔ طوق سلاسل اور زنجیروں کی جھنکار اس بوڑھے کے آہنی عزم کو شکست نہ دے سکے۔ جیل کی تنگ دامانی اور ماحول کی کافر سامانی اس بوڑھے مجاہد کے جذبۂ صدق و صفا کو زخمی نہ کر سکے۔ گویا حضرت مولانا فطرت سے ایک غازی کا دل اور ایک مجاہد کا ذوق شہادت لائے تھے۔ آپ ہمیشہ فرماتے! کاش! کفر کے مقابلہ میں کٹ جانے کا موقع ہاتھ آئے احمد علی کے سینے میں گولی لگے۔ اور خون شہادت کے چند قطروں سے حق و صداقت کی سرزمین لالہ زار بنے۔

حضرت یہ حسرت دل ہی دل میں لے کر گئے۔ اس حسرت کی بلندی کس قدر دیدہ زیب ہوتی ہے جب کہ ذہن اس حقیقت کی طرف منتقل ہو کر

واضح رہنمائی کرتا ہے کہ یہ حسرت تو پیغمبر اسلام کی حسرت تھی۔ یعنی رسول ہاشمیؐ بسا اوقات فرماتے تھے۔

"کاش! اللہ کا رسولؐ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے، اسے پھر زندہ کیا جائے، پھر شہید ہو جائے۔ غرض شہادت کا یہ سلسلہ برابر جاری رہے۔"

برسبیل تذکرہ جہاد کی بات چل نکلی ہے تو مناسب ہے ذرا اس پر اجمالی تبصرہ ہو جائے۔ اس تبصرہ کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ آج لفظ جہاد ایک بے معنی لفظ بن کر رہ گیا ہے۔ صحابہ کرام کے سنہری دور میں یہ لفظ جہاد اپنے دامن میں ہیرے کی چمک، قوس قزح کی ترماہٹ اور اس کا گداز رکھتا تھا۔ ایک خوبرو مجاہد اسلام اپنی نئی نویلی دلہن کو بیاہ کر لاتا ہے۔ بیوی چندے آفتاب چندے ماہتاب ہے اور ظاہر ہے کہ بیوی سے محبت کا ہونا ایک فطری امر ہے۔ لیکن ادھر سے جہاد کا بگل سنائی دیتا ہے۔ یہ حسین مجاہد اپنی حسینہ کی کافرادائں کو الوداع کہہ کر میدان کارزار کی طرف اس طرح مجنونانہ وار بڑھتا ہے۔ گویا دنیا وجہاں کا حسن سمٹ کر اس میدان جہاد میں آکر براجمان ہو گیا ہے۔ جس کی پرستش کو اس مجاہد کا عشق والہانہ انداز میں سرنگوں ہو کر چلا آیا ہے یہ واقعہ ہے جسے تاریخ اور حدیث نبویؐ نے انتہائی حزم و احتیاط سے اپنے سینے میں ضبط کر رکھا ہے لیکن اس قسم کے واقعات کا ذکر ایسی قوم کے روبرو پیش کرنا یقیناً ناانصافی اور ظلم و عدوان ہے کہ جس قوم کے بوڑھے لکھنؤ مرحوم کے نوابوں کی طرح بٹیر بازی کا شغل فرما رہے ہیں اور نوجوان ہیں کہ بے فکروں کی طرح آوارہ قہقہوں کے ہجوم میں بادیہ پیمائی

کرتے نظر آتے ہیں حوا کی بیٹیاں اور مریمؑ کی چہیتیاں ایک شان دلربائی کے ہمراہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شاہراہوں کا کلیجہ روندتی پھرتی ہیں ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

ہجوم خیالات سے میرا قلم موضوع سے کسی قدر دور چلا گیا ہے نفس مضمون کی اصل غایت یہ ہے کہ حضرت مولانا فطرت سے ایک حق گو کا دماغ لائے تھے۔ ایک حق بین اور ایک حق اندیش کا قلب وجگر لائے تھے۔ ان کے پاس کسی مسجد کے ملا کا دل و دماغ نہ تھا بلکہ صحابئ رسولؐ کا وہ جنون لائے تھے۔ جو ناموس رسالت کے تحفظ میں کٹ مرنا عین بقا سمجھتا ہے مختلف واقعات و حقائق اور مشاہدات و تجربات اس حقیقت کی غمازی کرتے ہیں کہ حضرت کو رسول گرامی کی ذات بابرکات سے ایک خاص کھچاؤ ایک خاص لگاؤ اور ایک خاص اُلکاؤ تھا۔ آپ رسول کریم کے لئے بے پناہ طوفان محبت اپنے پہلو میں لئے ہوئے تھے اگر سچ پوچھیں تو ایک مومن، کامل مومن اس طوفان محبت سے آشنا ہوئے بغیر ہو نہیں سکتا۔ یہ محض شاعرانہ مبالغہ آرائی اور جذباتی تک بندی نہیں بلکہ ترجمہ ہے اس حدیث رسول کا جس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ تم میں سے کوئی بھی اس وقت تک کامل مومن ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ تمہارے دل میں اپنے ماں باپ، بہن بھائی، عزیز و اقارب غرض دنیا کی ہر شے سے زیادہ محبت رسول خدا کی نہ ہو۔ عشق و محبت کی اس واردات میں وہ عورت کس قدر کامیاب ہے۔ جسے یہ خبر دی گئی کہ میدان جہاد میں اس کا خوبرو جوان بھائی مارا گیا ہے

بلکہ مخبر نے بھرائی ہوئی آواز میں یہ بھی کہا کہ عورت کا خاوند بھی میدان کارزار میں کام آ گیا ہے۔ یعنی اس کے سر کو اب بیوگی کی چادر نے ڈھانپ دیا ہے تاریخ کی وساطت سے ہم جانتے ہیں کہ مذکورہ عورت اپنے بھائی اور خاوند کی موت کی خبر پا کر ذرہ برابر بھی متردد نہ ہوئی، بلکہ اس کا جنون برابر فضاؤں اور خلاؤں کو گھورتا رہا۔ اس کی زبان پہ ایک اور صرف ایک سوال تھا۔ کہ میرے خاوند اور میرے بھائی کی موت کی خبر لانے والو! اتنا تو بتاؤ کہ محبوب خدا کس حال میں ہیں ؟ کیونکہ کائنات کی ساری زندگیاں صرف اسی ایک رسول خدا کی ذات گرامی پہ تصدق و نثار کی جا سکتی ہیں۔ یقیناً یہ فلسفۂ محبت عام فہم و شعور کی حدود میں مقید نہیں ہو سکتا لیکن ایک سچا عاشق رسول اس فلسفۂ محبت کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک شوشہ سے پوری طرح باخبر ہے۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں کی لحد پہ آسمان کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے آپ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

نہ کٹ مروں جب تک میں خواجۂ یثرب کی عزت پہ
خدا شاہد ہے کہ کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

ہمارے ہاں عاشقان رسول کی کمی نہیں یہ عاشق لوگ جلسے منعقد کرتے ہیں، جلوسوں کی قیادت کرتے ہیں۔ رقص فرماتے ہیں، بھنگڑا ناچ اور چمٹا بجانا ان کا محبوب مشغلہ ہے رسول خدا کے نام پہ چندہ جمع کرتے ہیں کھانا پکاتے ہیں، غریبوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ہوا کیا اگر کھانے کی دو تین دیگیں گھر پہنچانے کا اہتمام بھی کر پاتے ہیں آخر چندہ جمع کرنے کا سہرا بھی تو انہیں

عاشقان رسول کے سر ہے۔ جو شبانہ روز محنت شاقہ سے روپیہ فراہم کرتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی نکتہ چینی یار لوگوں کی ایک عادت ہوگئی ہے۔ آخر آپ کو کیا اعتراض ہے کہ اگر یہ عاشقان رسول جمع شدہ چندہ میں سے تھوڑا سا روپیہ شراب نوشی پر خرچ کر دیں۔ آپ خشک مزاج ہیں دیوبندی ہیں وہابی ہیں۔ اسرار کی حقیقت کو پانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ کیا جانیں وجد و تواجد کیا ہے۔ بھنگڑا کیا ہے۔ ناچ اور جمپٹا کیا ہے یہ فیضان فیض ہے شراب نوشی کا، حرام خوری کا اور حرام کاری کا، لیکن آپ لوگوں کی کوتاہ فہمی فطرت کے سربستہ رازوں کو کیا جانیں؛ جو رازہائے فطرت بھنگ اور شراب کے نشہ میں منکشف ہوتے ہیں۔ وہ بھلا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد کے مقدر میں کہاں؛ یہ ہے جھوٹے مجنوؤں کا ایک خطرناک گروہ جن کی خطرناک سازشوں نے دقار رسالت کا دامن تار تار کر دیا۔

آیئے آپ کو اب سچے عاشقان رسول سے متعارف کرائیں۔ آج سے تقریباً ۴۳ سال پہلے اسی لاہور میں ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا ــــ انجینیرنگ کالج کے انگریز پرنسپل نے محبوب خدا کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کے جملے کہہ ڈالے۔ انگریز کا عہد حکومت تھا۔ شاہی جلال سے فضا لرز رہی تھی۔ ماحول کانپ رہا تھا۔ اور وقت کے جھوٹے مجنوں مہر بہ لب تھے۔ کالج کے طلبا میں ایک اضطراب مسلسل تھا لیکن مجبور تھے کوئی پشت پناہ نہ تھی۔ مضطرب اور پریشان تھے، انھوں نے انگریز پرنسپل کے توہین آمیز رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ہڑتال کی لیکن ان کی تمام کوششیں صدا بصحرا

ثابت ہوئیں۔ رسولؐ کا وقار خطرہ میں تھا۔ کہ اتنے میں شیرانوالہ دروازہ سے اللہ کا شیر اٹھا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ اللہ کا یہ شیر میدان عمل کی طرف لپکا یہ تھپکی دینے والا اقبال تھا۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے ایک شور قیامت اٹھا۔ نتیجتاً حکومت کے ناعاقبت اندیشوں کو اس عاشق رسولؐ کے عزم راسخ کے سامنے جھکنا پڑا۔

کفر و باطل سے جہاد

حضرت شیخ التفسیرؒ کا فوری مزاج کے بے ضرر انسان تھے لیکن دجل و بطلان کے مقابلہ میں ایک کوہ گراں نظر آتے تھے۔ ہمالیہ کی بلندی، پہاڑ کی ہیبت اور سمندر کی گہرائی آپ کی صدق دلی کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی درجہ نہ رکھتے تھے۔ کسی کی دل آزاری آپ کی فطرت کے خلاف تھا۔ دلجوئی آپ کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اپنوں اور بیگانوں کے مابین ایک لطیف رابطہ و تعلق پیدا کرنے کے دلدادہ اور متمنی تھے لیکن اس کوشش میں حق و صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ بلکہ بڑی پامردی سے تصادمات حیات کے خلاف صف آرا ہو جاتے اور اس وقت تک سکون و قرار محسوس نہ کرتے جب تک کہ کفر و الحاد اور دجل و بطل کی رگوں سے لہو کا آخری قطرہ تک نچوڑ نہ لیتے۔ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ، شاہانہ کروفر، فلک بوس عمارات کا شکوہ اور کرسئ اقتدار کی ہیبت، غرض کوئی شے بھی آپ کے پائے استقلال میں لغزش پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ بلکہ آپ قدو گیسو، دارو رسن

صبح و شام اور شب و روز کے اتار چڑھاؤ کے مابین کچھ اس طرح اظہار خیال فرماتے ہے

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندہ حق بین و حق اندیش
خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند

ساتھیوں، رفیقوں، یاروں اور ہم عصروں سے چشمک زنی کرنا آسان ہے۔ لیکن حکومتوں کا بت کبریائی توڑنا قریب قریب ناممکن ہے اس کے لئے صور اسرافیل، ضرب ابراہیمی، عصائے موسوی اور خلق مصطفوی کی ضرورت ہے۔ حضرت مولانا کو نہ صرف ماحول کے پیدا کردہ ہنگاموں سے متصادم ہونا پڑا۔ بلکہ برطانوی دیو استبداد کا سر کچلنے کے لئے عصائے موسوی کی ضرورت آن پڑی، ظاہر ہے کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

حضرت فتنوں کے پروردگار نہ تھے بلکہ امن و آشتی اور صلح پسندی کے دلدادہ تھے۔ لیکن یہ حقیقت بھی آپ کی آنکھوں سے اوجھل نہ تھی: "وہ ہاتھ قابل قدر ہے جس میں صلح کا سفید جھنڈا لہرا رہا ہو۔ لیکن زندہ وہی رہ سکتا ہے جس کے ہاتھ میں شمشیر تابدار کا قبضہ ہو۔"

الغرض برطانوی تاجداروں سے یوم آزادی تک حصول آزادی کا حق مانگتے رہے، جیلوں میں گئے، ہجرت بھی کی۔ فاقہ مستی تک بھی نوبت آئی لیکن تحریک آزادی کا یہ مجاہد برابر آواز بلند کرتا رہا ع

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آلام و مصائب کے ہجوم میں بڑے بڑے دل گردے والوں کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر مصلحت کی کمین گاہ بنا لیتے ہیں۔ لیکن حضرت مولانا مصائب کا دل چیر کر برابر منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہی گئے۔ مصلحت بینی بھی عجیب شے ہے۔ ذی مرتبہ راہنمایان قوم آسانی سے اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جدید فن اخلاق کے ماہرین کہتے ہیں کہ مصلحت بینی ہی فلاح اور ہر دلعزیزی کی راہ ہموار کرتی ہے۔ یہ ماہرین فن اس خیال کے ہمراز ہیں کہ کفر و اسلام، حق و باطل، شرک و توحید، نور و حکمت، صداقت و کذب سب کو ایک ساتھ لے کر چلنا چاہیئے۔ اگر حق کوئی کا حق اس طرح ادا ہو سکے کہ باطل کا دل بھی ہاتھ میں رہے تو اس میں کیا مضائقہ؟ اہرمن و یزداں دونوں کو رام کیجئے، صرف کعبے ہی کے کیوں ہو رہیئے، جب بت کدے سے بھی رسم و راہ قائم رہ سکے۔

معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق ست

با ما شراب خورد و بزاہد نماز کرد

حضرت مولانا حق و باطل کے مابین کوئی نئی راہ تلاش نہیں کرتے۔ ان کا یقین ہے کہ حق کی حمایت کرو گے تو باطل ضرور روٹھے گا۔ یہ ممکن نہیں کہ حق و باطل دونوں کی رضا جوئی کی جائے۔ ان میں سے ایک کے دامن عافیت

میں پناہ لینی ہوگی۔ اور دوسرے کے دامن کو جھٹک دینا ہوگا۔ لہٰذا حضرت رح نے اپنے لئے حق کی راہ متعین کی۔ اس لئے کہ یہی صلحاء و اتقیاء کی راہ مستقیم ہے اس مقام پر حضرت مولانا ابوالکلام آزاد اپنے ذاتی تاثرات ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"حق اور باطل دونوں آپ کے سامنے ہیں انہی میں سے کسی ایک کو پسند کر لیجئے۔ اگر حق کی راہ اختیار کی ہے تو پھر مصلحت پیرایہ بیان طرز ادا، الفاظ شہد نما و معانی زہر آلود اور اسی قبیل کی تمام باتوں کے لئے نفاق کے سوا اور کوئی لقب نہیں۔ سچ کہئے گا تو جھوٹ کو چوٹ لگے گی۔ اس کو بچانے کی کوشش نہ کیجئے۔ ورنہ آپ کفر سے زیادہ دنیا کے لئے مہلک ہیں، نرمی و آشتی، حسن ادا پیرایہ بیان، مصلحت بینی اور مقتضیات زمانہ کے اگر یہی معانی ہیں جو بتلائے جاتے ہیں۔ تو خدا کے لئے ہمیں سمجھایئے کہ پھر نفاق اور منافقی کی خصوصیات اور کیا ہیں؟ اگر ایک بات سچ ہے تو اس کو صاف صاف کہہ دیجئے اگر کچھ لوگ بُرے ہیں تو کھول کھول کر ان کی برائی بیان کر دیجئے، بری باتوں کے اظہار کے لئے اچھے لفظ کیوں اختیار کئے جائیں۔ بداعمالوں کو کیا حق ہے کہ نیک کرداروں کے حقوق کا مطالبہ کریں، اگر یہ طریقہ پسند نہیں تو پھر بتوں کو آستین میں چھپانے کی جگہ بہتر ہے کہ سر پہ جگہ دیجئے۔ ظاہر و باطن میں مطابقت جھوٹ میں بھی ہو تو سچائی سے خالی نہیں ؎

بس کافرست زاہد از برہمن ولیکن
او راہ بت ست در سر در آستین ندارد

حضرت مولانا بت شکن تھے، بت گر یا بت فروش نہ تھے۔ آپ کا یہ اعلان کس قدر موزوں، جامع، مناسب اور متناسب ہے ۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الّا اللہ

انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کی گراؤنڈ میں ایک جلسہ عام منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت اس وقت کے وزیر اعلیٰ خان عبدالقیوم خاں کر رہے تھے۔ حضرت مولاناؒ نے اس جابر وزیر اعلیٰ کی صدارت میں منعقدہ جلسہ عام میں وہ کھری باتیں سنائیں کہ اس کی جبیں جبروت پر پسینہ آنے لگا۔ حضرت نے فرمایا: "چائے کی ایک پیالی پر قلب و ضمیر کا سودا نہ کرنا اور نہ ہی بسکٹ کی لذت بے مایہ کے عوض نوابوں اور خانوں کو ووٹ دینا، بلکہ یہ ووٹ اس مستحق کو دو جو اسلام کی سچی تڑپ رکھتا ہو۔"

انقلابی حکومت کے اوائل میں اس قدر خوف و ہراس مسلط تھا کہ ہم نے بار لوگوں کو رات کے نو بجے کے بعد گھر سے باہر نہ آتے دیکھا۔ اس سے پہلے نیم شب تک انجمن آرائی ہوتی۔ لیکن انقلاب کے آتے ہی روز و شب میں انقلاب آگیا۔ لوگ مارے خوف کے گھر سے باہر قدم نہ رکھتے تھے کہ کہیں بیگار میں پکڑے نہ جائیں لیکن حضرت مولانا سکوت و جمود کے اس دور میں بھی دہلی دروازہ کے باہر نوبت ابراہیمی کے زور سے تازہ خداؤں کا بھرم کھول رہے تھے۔

عالم باعمل

علم وعمل فطرت کی دو آنکھوں کا نور ہے۔ علم کے بغیر عمل کی دنیا غیر آباد ہے۔ اور عمل کے بغیر علم زہر قاتل ہے۔ گویا دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا وجود ناکارہ ہے علم وعمل دونوں مل کر منزل مقصود کیطرف واضح رہنمائی کرتے ہیں۔ تاریخ کے اس دور میں علم وعمل کی نمایاں حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن عالم دین ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ بالخصوص عہد حاضر میں وہ لوگ فقیہہ شہر اور خطیب اعظم کا روپ دھار گئے ہیں۔ جن کو بات کرنے کا ڈھنگ نہیں اور قلم کو قط لگانے کا شعور تک نہیں باایں ہمہ علم دین کی اہمیت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے، کہ بے عمل عالم دین سے بدتر دنیا کی کوئی مخلوق نہیں۔ وہ اپنی بدکرداری سے نہ صرف اپنے آپ کو عذاب الیم کا مستحق قرار دیتا ہے بلکہ اپنے متبعین کے لئے بھی مصیبت کا ایک کوہ گراں بن کر رہ جاتا ہے۔ جبھی تو نبی کریم نے فرمایا، کہ بے عمل عالم دین کی بے عملی کے سبب پشت رسالت دوہری ہو جاتی ہے حالانکہ

عالم دین پشت رسالت کا آخری سنبھالا ہوتا ہے لیکن بے عمل عالم دین اپنی گمراہی اور ضلالت کے سبب وقار رسالت کے پُر نُور چہرہ پہ ایک بدنما داغ بن کر ابھر آتا ہے کس قدر خوش قسمت اور ذی جاہ ہیں وہ علمائے باعمل جن کے بارے میں محبوبؐ خدا نے کہیں تو یہ فرمایا کہ یہ علماء ربانی انبیا کے تخت و تاج کے وارث ہوتے ہیں اور کہیں یہ بشارت دی کہ عالم باعمل کی دوات کی سیاہی شہید کے خون سے افضل ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں کسی تاویل پسند مولوی کو جرأت اظہار کہاں! طاقت گفتار کہاں! اور یارائے سخن کہاں۔

ہندو پاک کے جس قدر بزرگان دین کے اسماء گرامی تاریخ کے سینے پر رقم ہیں۔ ان کی عملی زندگیوں کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر نظر کے سامنے آجاتی ہے کہ وہ سب کے سب علماء باعمل تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، خواجہ علی ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیری، حضرت مجدد الف ثانیؒ، بابا فریدالدینؒ گنج شکر، شاہ ولی اللہؒ سب کے سب اسی قبیل سے ہیں، گولڑہ کے پیر مہر علی شاہ جید عالم اور شب زندہ دار بزرگ تھے۔ ثقہ قسم کے بزرگوں کی وساطت سے معلوم ہوا ہے کہ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑہ والے زہد و اتقاء اور پرہیز گاری کے مجسمہ تھے نماز عشاء کے بعد نمازی، غازی سب کے سب نیند کی آغوش میں چلے جاتے۔ وحوش وطیور نیند کے مزے لیتے۔ ماحول ستانے کے لئے پاؤں پھیلا دیتا لیکن حضرت پیر مہر علی شاہ نماز عشاء کے بعد مسجد کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر اللہ کا نعرہ بلند کرتے۔ اللہ اللہ کی ضرب شدید سے دل دو نیم بے قرار ہو جاتا۔ اور

جب صبح کا موذن اذان کا پہلا جملہ اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا دیتا تو حضرت پیر مہر علی شاہ ہُو کا نعرہ بلند کرتے۔ غرض ساری رات اسم ذات کے ذکر و اذکار میں مشغول رہنا آپ کا محبوب مشغلہ تھا اور یہی شغل ان علمار کو مسند ولایت پہ براجمان کرنے میں مدد دیتا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی بھی اس کثرت سے ذکر و اذکار فرماتے۔ کہ عقل و شعور دنگ رہ جاتے۔ آپ کے اذکار کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ یقین سا ہو جاتا ہے کہ حضرت اس دنیا کے مکین نہ تھے بلکہ روحانیوں اور نورانیوں کی مجلس کے نمائندہ تھے۔ جو نورانیوں کی نمائندگی کے لئے اہل دنیا کی مجالس میں شریک ہو گئے تھے۔ عالم دین صرف منزل مقصود کی طرف اشارہ کرتا ہے لیکن عالم باعمل منزل مقصود تک پہونچنے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ حضرت لاہوری رح ظاہری علوم کے علاوہ باطنی علوم کے بھی فاضل تھے چنانچہ فرماتے ہیں:

"میری عمر تقریباً نو سال کی تھی جب میں نے حضرت دین پوری کے ہاتھ پہ بیعت کی۔ آپ میری بیعت کے بعد ۴۰ سال تک زندہ رہے اور ۱۰۱ سال کی عمر میں وصال فرمایا۔ حضرت امروٹی بھی میری تربیت فرماتے رہے دونوں نے مجھے اللہ کا نام تبلایا اور دوسروں کو اللہ کا نام تبلانے کی اجازت مرحمت فرمائی"

حضرت روحانی اعتبار سے بھی ایک بلند مقام پہ فائز مرام تھے اس ضمن میں یہ واقعہ نہایت اہم ہے جس کا ذکر آپ اس انداز میں کیا کرتے تھے آپ کاڈبی بازار میں سے ایک دفعہ گزر رہا۔ سر راہ ایک درویش مرد نے آپ کو کلائی سے پکڑ لیا اور کہا۔ احمد علی اس بازار میں سے ہزاروں لوگ گزرے ہیں۔ کوئی

کتا، کوئی خنزیر، کوئی بندر نظر آتا ہے، مجھے کوئی بھی انسان نظر نہیں آیا حضرت لاہوری نے اس کے جواب میں کہا کہ حضرت! میں کیا دکھائی دیتا ہوں۔ اس مرد درویش نے کہا۔ احمد علی! آنکھ جھکا کر دیکھو! تم کیا ہو، حضرت لاہوری فرماتے ہیں۔ کہ میں نے حسب ارشاد آنکھ جھکا کر دیکھا تو میں نے اپنے آپ کو ہرن پایا۔ حضرت نہ صرف خود پیر کامل تھے بلکہ ناقصاں را رہنما کا درجہ رکھتے تھے۔ آپ کا یہ ارشاد کس قدر مبنی بر حقیقت ہے:

"میں نے بفضل ایزدی سندھ سے بڑی نعمتیں حاصل کی ہیں، ان میں سے ایک دل کی بصیرت ہے، میرا دعویٰ ہے کہ چار سال کا خرچ بیوی بچوں کو دے کر میرے پاس آجاؤ، مسجد لائن والی میں نیم کے پیڑ کے نیچے بٹھلاؤں گا۔ اور صرف وہ چیزیں کھانے کو دوں گا جو حلال ہوں گی۔ حرام کھانے سے یہ نور حاصل نہیں ہوتا۔ میں نے خود ۴۰ سال صرف کئے ہیں لیکن تم کو ۴ سال میں یہ سکھا سکتا ہوں۔"

حضرت مولانا واقعی پیر کامل تھے، زاہد تھے، عابد تھے، متقی و پرہیزگار تھے اس زہد و اتقا نے آپ کو یہ مرتبہ عطا کر دیا کہ آپ یہ تک فرمانے لگے۔ احمد علی ڈنکے کی چوٹ بتا سکتا ہے کہ اس قبر کا صاحب مزار جنت میں ہے یا جہنم میں۔ آپ کی توجہ کا ہمہ گیر اثر سب پر واضح ہے ایبٹ آباد کے خطیب مولینا محمد اسحٰق صاحب فرماتے ہیں کہ ۱۹۶۰ء میں حضرت لاہوری ایبٹ آباد میں تشریف لائے جمعہ کا دن تھا لہٰذا آپ سے تقریر کی درخواست کی گئی۔ آپ نے یہ کہہ کہ انکار فرمایا۔ "آپ، تقریر بھی کریں اور نماز بھی پڑھائیں۔ البتہ میں آپ پر توجہ دوں گا۔"

مولانا اسحٰق صاحب کا بیان ہے کہ وہ ۴۰ سال کی طویل مدت سے خطابت کے فرائض ادا کر رہے ہیں لیکن تقریر میں جو رنگ، جوش و خروش اور ولولہ اس دن کی تقریر میں پیدا ہوا چالیس سالہ دورِ خطابت یہ رنگ پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

ایک نوجوان حاضر خدمت ہو کر عرض گزار ہوا۔ کہ حضرت سنیما بینی سے نمایاں دلچسپی ہے طبیعت قطعاً نہیں رکتی۔ حضرت نے ایک لمحہ کے لئے سکوت فرمایا۔ اور متوجہ کر کے پوچھا۔ "اب کیا حالت ہے؟"

وہ نوجوان بےساختہ پکار اٹھا "حضرت اب دل میں نفرت پیدا ہو چکی ہے۔" یہ اعجاز ہے آپ کی فرشتہ سیرت کا۔ آپ کے زہد و اتقا کا۔ آپ کے انتہائے تقدس کا۔ علامہ اقبال بجا فرماتے ہیں ؎

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

عمومی تعلیمات

حضرت لاہوری رح کی عمومی تعلیمات کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے :

(۱) ذکر اسم ذات کی پابندی کرنا

(۲) نماز پنجگانہ کی پابندی کرنا

(۳) کسی کو دکھ نہ دینا

یہ تعلیمات دیکھنے میں سادہ اور معمولی نوعیت کی ہیں لیکن غور و تردد سے دیکھیں تو نتیجہ معنی خیز ہے، ان تعلیمات میں حقوق اللہ اور حقوق العباد مرکزی کردار ہیں۔ اگر سچ پوچھیں تو اسلام کے یہی دو ستون ہیں جن سے اسلام کا تاج محل قائم رہتا ہے، یہ تعلیمات تو عام ہیں جن کا پرچار ہر معمولی پیر بھی کرتا رہتا ہے۔ لیکن حضرت مولانا مذکورہ بالا عمومی تعلیمات روحانی کے علاوہ ایسی تعلیمات کے معلم بھی ہیں۔ جو عہد حاضر کے پیروں کے فہم و شعور سے بالاتر ہیں یعنی مولانا رزق حلال پر خاص زور دیتے ہیں پیر و علما اس نکتہ کی اہمیت سے یا تو عمداً گریز کرتے ہیں یا اسے قابلِ قبول توجہ نہیں سمجھتے۔ حالانکہ روحانی

مقاصد کے حصول ہیں، یہ نکتہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے کیونکہ رزق حلال کے بغیر سلوک و معرفت کے منازل طے کرنا ممکن نہیں، قرآن پاک میں جابجا رزق حلال کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"شکرِ خداوندی اور ربِ کریم کی عبادت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ رزق حلال میسر نہ ہو۔"

ایک حدیث میں فخرِ دو عالم یوں ارشاد فرماتے ہیں:

"بعض لوگ ہاتھ لمبے کر کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو رب رب کہہ کر پکارتے ہیں۔ مگر اُن کا عملی حال یہ ہے کہ کھانا حرام کا، لباس حرام کا۔ تو ان کی دعا کیسے قبول ہو۔"

اولیاء اللہ رزق حلال کے ہمیشہ متمنی رہے اور کبھی اور ہرگز کبھی رزق حرام کے تر نوالوں سے اپنے کام و دہن کو آلودہ نہ کیا۔ مغلیہ خاندان کا ایک عظیم المرتبت تاجدار حضرت میاں میر کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے بوریا نشین درویش نانِ جویں کا ایک ٹکڑا ہندوستان کے نامور بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ شاہی حلق نانِ جویں کی درشتی اور سختی کو گوارا نہ کر سکا معذوری کا اظہار کرتا ہے۔ رخصت کے وقت اشرفیوں کے ڈھیر مردِ درویش کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ حضرت نے غضب آلودہ نظروں سے ملک کے نامور حکمران کی طرف دیکھا اور کہا: اے بادشاہ! جس طرح جو کی روٹی کا ٹکڑا تیرے حلق سے نیچے اتر نہیں سکتا۔ بعینہٖ یہ اشرفیاں میرا گلا قبول نہیں کرتا۔

یہ استغنا و بے نیازی کی ایک علامت ہے جس کی سرحد رزق حلال

کی آرزو کی سرحد سے جا ملتی ہے۔ حضرت لاہوری کھانے کے معاملہ میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے جہاں تک ممکن ہوا غیروں کے تر نوالوں سے کام و دہن کو محفوظ رکھا۔ ہمارے ایک معتبر دوست نے ہمیں بتایا کہ لاہور کے ایک ڈاکٹر صاحب تھوڑا سا مکھن لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ حضرت نے مکھن سونگھ کر فرمایا۔ ڈاکٹر! اس مکھن میں مجھے حرام کی بُو آتی ہے۔ ڈاکٹر متحیر اور ششدر ہے کہ یہ بات کیا ہوئی، نہایت عجز سے عرض پرداز ہوا۔ حضرت میری ذاتی بھینس ہے اور یہ اسی کا مکھن ہے پھر حرام کیونکر؟ حضرت لاہوری مسکرائے۔ فرمانے لگے۔ ڈاکٹر صاحب آپ کا نوکر چارہ لینے گیا۔ قیمتاً لئے گئے چارہ میں تھوڑا سا چوری کا چارہ بھی ملا لیا گیا۔ تمہاری بھینس نے یہ چوری کا چارہ کھایا ہے۔ اسی لئے مکھن سے حرام کی بُو آرہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے معاملہ کی تحقیق کی تو حضرت لاہوری کا ارشاد درست ثابت ہوا۔

الغرض تاحین حیات طیب رزق کی تلاش میں رہے اغلباً یہ اسی کشاکش کا نتیجہ ہے کہ حضرت دور دراز جلسوں میں شریک ہونے کے باوجود منتظمین جلسہ کے ہاں کھانا نہ کھاتے بلکہ بھنے ہوئے چنوں اور گڑ پہ گزارہ کرتے تھے۔ اگر کھانے کو کچھ بھی میسر نہ ہوا تو فاقہ کشی کر لی، لیکن رزق حرام کے قریب تک نہ گئے۔ چنانچہ حضرت لاہوری فرماتے ہیں:

• حاصل یہ نکلا کہ اللہ پاک کے نام میں بیشمار خاصیتیں ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان ماسوا اللہ سے کٹ کر اللہ سے جڑ جاتا ہے اس کے لئے علاج یہ ہے کہ ذکر بکثرت کیا جائے اور پرہیز یہ ہے کہ مشتبہ اور حرام سے بچا جائے۔

حرام کی تشریح ان الفاظ میں سنیئے:

حرام کی دو قسمیں ہیں صورتاً حرام مثلاً سور، کتا۔ حقیقتاً حرام مثلاً بکری کا گوشت، بظاہر حلال ہے، اگر چوری کی ہو گی تو حقیقتاً حرام ہو گا۔"

حضرت کو یہ سبق اپنے شیخ حضرت دین پوری سے ملا۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"حضرت دین پوری اللہ اللہ کرنے والی جماعت کو پھیکا بھات دیتے تھے۔ جس میں نہ نمک نہ میٹھا ہوتا تھا۔ اس میں حلال کے چاول اور پانی ہی ہوتا تھا۔ یہ اس لئے کرتے تھے کہ اللہ اللہ کرنے والی جماعت کے پیٹ میں حرام کا لقمہ نہ جانے پائے۔ حضرت دین پوری خود بینا تھے۔ ان کی وجہ سے ساری جماعت حرام سے بچ جاتی تھی۔

ذیل کا واقعہ رزق حلال کی اہمیت میں دو چند اضافہ کرتا ہے۔ اور یہ حقیقت واضح طور پر نظر کے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہے کہ حرام سے بچنے والوں کی رب پاک دستگیری فرماتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ دیوبند کے ایک صوفی منش بزرگ کا پیٹ حرام کا ایک نوالہ بھی قبول نہ کرتا تھا بلکہ فوراً اسے قے کی صورت میں باہر اگل دیتا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے آپ کو مدعو کیا اور ہر ممکن تدبیر کی کہ کھانے میں کوئی مشتبہ چیز پکنے نہ پائے، کھانے میں کھیر بھی تھی، کھیر کا کھانا تھا کہ وہ فوراً قے کی صورت میں باہر آگئی۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا، کہ جس بھینس کے دودھ سے کھیر پکائی گئی تھی اس بھینس نے اپنی ہمسایہ بھینس کا تھوڑا سا چارہ کھا لیا تھا۔ ان تصریحات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رزق حلال کس قدر اہمیت کا مالک ہے۔ اور اگر کوئی رزق حرام سے ملی

ولی طور پہ بچنے کا متمنی ہو تو قدرت خود اسے بچا لیتی ہے، الغرض حضرت لاہوری کا تقویٰ برابر مشتبہ اشیاء سے پرہیز کرتا رہا۔ اسی گریز و پرہیز نے آپ کو ولی اللہ بننے میں مدد دی۔ حضرت کی ایک نمایاں تعلیم تھی۔ توکل علی اللہ عربی مقولہ ہے یا حدیث نبوی من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ، اس جملہ کی عظمت اور صداقت میں کلام نہیں۔ لیکن اس جملے کے ادا کرنے والوں کو آلام و مصائب کے ہجوم میں یہ جملہ اپنی تمام تر فضیلت و صداقت کے باوجود بھول جاتا ہے لیکن حضرت لاہوری کو دیکھو قید فرنگ میں مقید ہیں نومبر و دسمبر کی یخ بستہ راتیں ہیں ہوائیں خنکی ہے لہو منجمد ہو رہا ہے۔ حضرت کے پاس اوڑھنے بچھونے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ حضرت لاہوری ایک شکستہ مسجد کے ایک گوشہ تنہائی میں ایام نظر بندی گزار رہے تھے اس حالت میں کہ سردی اور ٹھنڈک سے بچاؤ کے لئے آپ کے پاس کوئی لحاف وغیرہ نہ تھا ایک نمازی آپ سے اکثر کہا کرتا۔ "اگر آپ فرمائیں تو بستر لادوں"۔ حضرت چونکہ توکل علی اللہ کے عقیدہ پر سختی سے کاربند تھے بلکہ آپ کا جزو ایمان تھا اس لئے آپ شدید ضرورت کے باوجود فرماتے، "اللہ جس حال میں رکھے راضی ہوں"۔

آپ کے شیخ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ آپ مجسم سوال بننا شان کردگار کو چیلنج کرنے کے مترادف جانتے تھے، یہی نہیں حکایت حال بھی شکایت ذوالجلال ہے ظاہر ہے کہ جو رزق حلال اور توکل علی اللہ پہ جان و دل سے کاربند ہو، اس پہ کیوں نہ ولایت ناز کرے۔ فخر کرے، غرور کرے۔

مجلسِ ذکر

روحانی اعتبار سے مجلس ذکر ایک خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ حضرت شیخ التفسیر نے مجلس ذکر کے قیام سے دین داروں اور پاک بازوں کے سکونِ قلب کے لئے ایک غیر فانی ورثہ چھوڑا ہے یہ آپ کی ابدی زندگی کی ضمانت ہے آپ کا یہ عملِ خیر تا ابد زندہ رہے گا۔ اور جویانِ حق و معرفت اس کارِ خیر سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ یہ عمل ایک ایسا پھول ہے جو کبھی مرجھا نہیں سکتا۔ ایک ایسا چشمۂ فیض ہے جو کبھی خشک ہو نہیں سکتا۔

مجلس ذکر کی اہمیت اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ جب کہ ذہن اس حدیث نبوی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے پاک فرشتے اللہ کا ذکر و اذکار کرنے والوں کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ رب کریم کے استفسار پر فرشتے جواب دیتے ہیں کہ یہ ذاکر دل میں ان دیکھی جنت کی چاہت رکھتے اور اسی طرح ان دیکھے جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں سے پناہ مانگتے ہیں۔ فرشتوں کے اس جواب پر رب کریم فرماتے ہیں۔ اے

فرشتو! تم گواہ رہو، میں نے ان کو بخش دیا۔ ایک فرشتہ کہتا ہے۔ اے پروردگارِ عالم! ایک آدمی کسی کام کی غرض سے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ذکر کے لئے نہیں آیا تھا۔ ربِّ دوجہاں فرماتے ہیں۔ کہ یہ ایسے بیٹھتے ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والے بھی خالی نہیں جاتے۔

اس حدیث رسول کی روشنی میں مجلس ذکر کے چھپے ہوئے خدوخال بھی اجاگر ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے تبلیغی جماعت کے کارکنوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ کسی کی دل آزاری نہیں کرتے۔ خود نمائی کا جذبہ یہاں مہر بہ لب ہے۔ یہاں غرور و تکبّر لفظ بے معنی ہے بلکہ سادگی اور طہارت قلب پاکبازی اس جماعت کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی کیفیت ہمیں حضرت مولانا کی قائم کردہ مجلس ذکر میں پیش آتی ہے۔ آج سے تقریباً دس بارہ سال قبل مجھے حضرت شیخ التفسیر کی مجلسِ ذکر میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ خود نہ آیا بلکہ لایا گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ان دنوں میں اسلامیہ کالج لاہور میں فسٹ ائیر کا طالب علم تھا۔ یعنی سترہ سالہ سنِ تھا۔ لڑکپن کا دور تھا۔ غم امروز فردا سے نابلد تھا کالج کے ہنگاموں کی روحِ رواں تھا۔ اس لئے مذہبی مشاغل سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ میرا ایک بچپن کا دوست مجھے بصد اصرار مجلس ذکر میں کھینچ لایا۔ شام کا آنچل گر چکا تھا۔ سورج دن بھر کا سفر طے کر کے کہیں خلاؤں میں جا کر ڈوب گیا۔ رات کی زلفِ دراز آہستہ آہستہ سینۂ گیتی پر بکھر رہی تھی۔ گویا شب کی تنہائیاں آرام و سکون کی خاطر کسی گوشۂ عزلت میں پناہ ڈھونڈ رہی تھیں۔ میں اور میرا دوست دونوں مسجد کے اندر بالائی حصہ میں منعقدہ مجلسِ ذکر میں شریک ہوئے

مختلف لطائف و وظائف اور ذکر و اذکار کے بعد سب حاضرین پر سکوتِ مرگ طاری ہو گیا۔ چونکہ بتی گل تھی اس لئے اپنے قرب و جوار میں بیٹھے ہوئے حضرات کی نقل و حرکت اور نگہ و نظر کو بھانپ نہ سکا۔ البتہ ان کی خاموشی سے یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ لوگ گیان، دھیان میں مصروف کار ہیں۔ چنانچہ میں بھی سر کو زانو کے حوالے کر کے شانِ کردگار کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگا، جیسے کانپو کا بخار چڑھ گیا ہو۔ مجلس ذکر جو برخاست ہوئی تو میں بھی اپنے دوست کے ہمراہ حضرت کی خدمت میں سلام عرض کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ خدا گواہ ہے حضرت نے بغیر کسی تعارف اور جان پہچان کے بے ساختہ کہا "بیٹیا آیا کر، اللہ والوں کی مجلس میں یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ بلاشبہ نیک صحبت خوش آئند نتائج مرتب کرتی ہے جب کہ بدوں کی صحبت رذالت اور ذلالت کا پیش خیمہ ہوتی ہے اس ضمن میں رسول گرامی کا یہ ارشاد آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

"اچھی صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے عطر فروش کی دکان ہو۔ جو شخص ایسی دکان میں جائے گا، چاہے وہ عطر نہ بھی خریدے، کم از کم خوشبو تو ضرور سونگھے گا۔ اور بری صحبت کو لوہار کی بھٹی سے تشبیہہ دیتے ہوئے فرمایا کہ ایسی دکان میں جانے والا اگر کچھ بھی نہ لے گا تو کپڑے ضرور جلا کر آئے گا۔"

خواجہ معین الدین چشتی رح فرماتے ہیں "صحبت نیکاں نیک و صحبت بداں بدتر از بدی" اللہ والوں کی صحبت قابل قدر ہے یہاں ذرہ رشک آفتاب بنتا ہے۔ اور مسلا ہوا پھول گل نو بہار کا روپ دھار لیتا ہے یہ رسول ہاشمی ص

کے فیضِ صحبت کا اعجاز و اثر تھا۔ کہ ابوبکر صدیق بن گئے۔ کہ عمر عمرِ فاروق بن گئے۔ عثمان عثمان غنی بن گئے۔ اور علی شیرِ خدا کے لقب سے ملقب ہو گئے اس نکتہ کی طرف فرماتے ہوئے حضرت مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"امراض روحانی کا علاج صحبتِ شیخ کے سوا کچھ نہیں کتابیں پڑھنے سے یہ دور نہیں ہوتے۔ دینی مدارس میں کتابوں پر عبور حاصل ہو جاتا ہے مگر تکمیل نہیں ہوتی۔ اس لئے علما کی بھی کما حقہٗ اصلاح نہیں ہوتی بعض امراض روحانی جسمانی امراض سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ جسمانی بیماریاں قبر کے ورے ختم ہو جاتی ہیں روحانی بیماریاں ساتھ جاتی ہیں۔ زمینداروں سرکاری ملازمین اور تاجروں کو تو جانے دیجئے اہلِ علم بھی ان سے نجات نہیں پا سکتے۔ جب تک کہ خاص اہتمام نہ کریں۔ مدارسِ عربیہ میں طلبا کو علم دانستن کے درجے پر حاصل ہوتا ہے۔ داشتن کے درجے پر نہیں، یعنی وہ دین سمجھ کر آتے ہیں لیکن اکثر ان میں سے ایسے ہوتے ہیں جن پر دین کا عملی رنگ چڑھا ہوا نہیں ہوتا، اس لئے علمار کے اندر بھی علین روحانی بیماریاں باقی رہتی ہیں جب تک کہ اللہ والوں کی صحبت نصیب نہ ہو۔"

ایک اور موقع پر یوں ارشاد فرماتے ہیں:

امراض روحانی کا علم علمار کی صحبت میں ہوتا ہے اور ان سے شفاء صوفیائے کرام کی صحبت میں ہوتی ہے۔ میرے دو مربی ہیں حضرت دین پوری اور حضرت امروٹی۔ دونوں سے میں نے کسی کتاب کا ایک سبق بھی نہیں پڑھا

دونوں کے دروازہ کی گدائی کی جو کچھ ملا وہ دیا۔ اللہ تعالےٰ نے لکین ذریعہ وہ حضرت بنے یعنی ان بزرگوں کے فیض صحبت سے سب کچھ ملا۔

آخر یہ فیض صحبت کیا ہے؛ اس سوال کا جواب وسعت صحرا کا طلب گار ہے، لیکن حضرت شیخ التفسیر اعجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے کس قدر معنی خیز اور فکر انگیز نکتہ نگاہ پیش فرماتے ہیں۔

کامل سے فیض حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عقیدت ادب اور اطاعت میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آئے۔

جب کبھی اللہ تعالےٰ ۲۵ روپے مٹھی میں دے دیتے تو امروٹ شریف چلا جاتا۔ ایک دن اور ایک رات رہتا تھا۔ اگر ان تین تاروں عقیدت، ادب، اطاعت میں سے ایک بھی کٹ گیا تو طالب گیا۔ میں نے ان گنہگار آنکھوں سے اپنے دونوں مریبوں کے ہاں دیکھا کہ عقیدت، ادب اور اطاعت کرنے والے چند دنوں میں جھولیاں بھر کر لے گئے اور جنھوں نے ایسا نہیں کیا وہ ساری عمر صحبت میں رہ کر بھی محروم رہے۔ اینٹ اگر بھٹے میں ڈالی جائے اور نہ پکے تو پلّی کہلاتی ہے، کہتے ہیں کہ پلّی سے کچی اینٹ بہتر ہوتی ہے کہ وہ مینہ کا مقابلہ پلّی سے زیادہ کرتی ہے اس طرح اگر اللہ تعالےٰ کسی اللہ والے کے ہاں لے جائیں تو وہاں سے پک کر نکلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

ایک اور جگہ اسی نکتہ کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس کے سوا باقی تمام کمالات نبوی کے حاملین اب تک رہے ہیں۔ اب بھی موجود ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ انہی کی

صحبت میں اصلاح حال ہوتی ہے، اللہ والے موتیوں سے بھی گراں قیمت ہیں۔ موتی ملنے ارزاں، لیکن اللہ والے ملنے گراں۔ وہ نایاب نہیں کمیاب ہیں۔ اگر کامل مل جائے تو اس کے قلب سے ادب، عقیدت اور اطاعت کی تین تاریں جوڑنے سے فائدہ ہوتا ہے اس کے بغیر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں بھی رہنے والے محروم رہے جن کو آنحضرت صلعم کا نہ پاس ادب تھا نہ عقیدت تھی اور نہ وہ اطاعت کرتے تھے۔" یہ ہے مجلس ذکر جس کا اہتمام حضرت شیخ التفسیر نے کیا۔ یہ مجلس ذکر اب بھی قائم ہے اور اس وقت تک قائم دائم رہے گی۔ جبتک کہ یہ دنیا و جہاں آباد ہیں ﴿

وفات

ابتدائے آفرینش سے حیات و موت کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر زندگی کو لقمۂ اجل ہونا ہے۔ موت سے فرار ممکن نہیں، شاہ و گدا، امیر و فقیر، کہتر و مہتر سب کے سب موت کے ہاتھوں مجبور محض ہیں۔ اولیا اللہ، صلحا و اتقیا اور انبیا بھی موت کی دستبرد سے بچ نہیں سکتے۔ قرآن کا یہ فرمان اٹل ہے:

کل نفس ذائقۃ الموت۔ کل شئی فان۔ صرف خدا کی ذات گرامی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ باقی ہر ذی [illegible] کے مقدر میں موت لکھی جا چکی ہے موت کے وجود سے انکار ممکن نہیں جب یہ حقیقت ہے کہ موت اٹل ہے۔ اس سے نجات ممکن نہیں۔ تو پھر کیا یہ غور و تامل ضروری نہیں کہ ہم اپنی زندگی کو زندگی دینے والے کے سپرد اس طرح کر دیں کہ منشائے ایزدی پورا ہو جائے۔ ہمیں راضی برضا ہو کر اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دینی چاہیئے۔ اس موقع پر مولانا آزاد کا یہ ارشاد کس قدر معنی خیز ہے۔

"اے عزیزانِ غیور! مال و متاع دنیوی کا جو حال ہے وہ کس کی

نظر سے پوشیدہ ہے؟ کون ہے جس نے اپنی زندگی میں دولت و جاہ کے فنائے عاجل کے دو چار تماشے نہیں دیکھے ہیں۔ رہی جان تو وہ بھی ایک جنس فانی ہے جو رہنے کے لئے نہیں بلکہ جانے کے لئے ہے، آپ دیں یا نہ دیں لینے والا ایک دن لے کر ہی چھوڑے گا، پھر جو چیز رائیگاں جانے والی ہی ہے اگر اسے دے کر مفت کا احسان اپنے دوست کے سر رکھ سکیں تو اس سے بڑھ کر اور کون سا سودا ہو سکتا ہے؟

جان بجاناں دہ، وگرنہ از تو بستاند اجل
خود تو منصف باش حافظ ایں نکو یا آں نکو۔

ایک اور موقع پہ اسی نکتہ کی وضاحت حضرت مولانا ابوالکلام اس طرح فرماتے ہیں:

"مسلمانو! یاد رکھو کہ اوروں کی جانیں ان کے قبضہ میں ہوں گی مگر ہم مسلمانوں کی جانیں ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ اسلام ایک خرید و فروخت ہے۔ جو ناقص کو لیتا ہے اور کامل کو دیتا ہے فنا کو خریدتا ہے اور بقا اس کی قیمت میں دیتا ہے۔ ہم نے جس وقت اقرار کیا کہ ہم مسلمان ہیں، اسی آن اس کا بھی اقرار کیا۔ کہ ہماری جانیں اسلام کے ہاتھ بک گئیں۔ اسلام کے معنی یہی ہیں کہ خدائے واحد کے آگے اپنی گردنوں کو جھکا دینا۔ پھر وہ خواہ اسے دوستوں کی گود میں ڈال دے یا دشمنوں کی تیغ کے سپرد کر دے۔"

المختصر ہماری زندگی بے بس ہے، موت کے سامنے سرنگوں ہے۔ اور

موت کی بالادستی مسلم ہے ابو ذیب ہذلی ٹھیک کہتا ہے :

واذا المنیۃ انشبت اظفارھا ۔ الفیت کل تمیمۃ لا تنفع ۔

(موت نے جہاں اپنے ناخن مارے کہ پھر تم کسی ٹونے ٹوٹکے کو سود مند نہ پاؤگے)

ہمارا ایک اردو شاعر کس قدر بھرائی ہوئی آواز سے پکارتا ہے ؎

رات دن زیر زمین لوگ چلے جاتے ہیں !
نہیں معلوم تہ خاک تماشا کیا ہے،

مومن کی موت کس قدر معزز ہے ذی جاہ اور عالی شان ہے، مومن کی موت پر ہزاروں زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں کیونکہ مومن پر جب موت وارد ہوتی ہے تو وہ خندہ زن ہوتا ہے۔ ہزار مسکراہٹوں کے ہجوم میں موت کا استقبال کرتا ہے لیکن اس عالم میں ایک عالم اشکبار ہوتا ہے سینہ فگار ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کیا فرماتے ہیں :

نشان مرد مومن با تو گویم !
چوں مرگ آید تبسم برلب اوست

مومن موت سے خوف زدہ نہیں ہوتا، بلکہ موت مومن کے جسد اطہر کا احترام کرتی ہے۔ حضرت مولانا سچے مومن تھے اس لئے جذبۂ ایمان سے معمور ہو کر یوں نغمہ زن ہوتے ہیں :

"میں نے اللہ تعالےٰ سے جو مانگا، وہ مجھے دیا۔ میں اس سے راضی ہوں جب بلائے میں حاضر ہوں۔"

ایک اور مقام پر موت کی پذیرائی کو جملہ استفہامیہ اس طرح ادا کرتے ہیں:

پانچ سال ہو گئے ہیں میں نے درزی کو بلا کر اپنے ماپ کا کفن تیار کرا لیا تھا میں ہر وقت موت کے لئے تیار ہوں۔"

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا موت سے متردد نہ تھے بلکہ ہر لمحہ ایک ایک عاشق صادق کی طرح موت کے انتظار میں رہے اس لئے کہ دل مومن تھا ذہن صاف تھا دماغ اور حافظہ نور فطرت سے معمور تھے۔ پھر ایسے دل و دماغ میں موت کا خوفناک تصوّر کیونکر سما سکتا ہے؛ یہ مرد خدا سر بسجود ہے سجدہ ریز ہے ناصیہ فرسا ہے۔ رب کائنات کی ربوبیت کا اقرار کرتا ہے اس کی عظمت کے گن گاتا ہے اس کی تقدیس بیان کرتا ہے۔ اور سبحان ربی الاعلیٰ کا ورد کرتے کرتے رب اعلیٰ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جا ملتا ہے۔ ایسی موت پر کون ناز نہ کرے۔ یہ موت قابل رشک ہے زندگی اس موت پر ہزار جی سے قربان ہے کیونکہ اس موت کی کوکھ سے ہزاروں زندگیاں جنم لیتی ہیں۔ جانے والا مسکراتا ہوا گیا کھلکھلاتا ہوا گیا۔ لیکن وہ اپنے پیچھے ایک عالم سوگوار چھوڑ گیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ حضرت شیخ التفسیر کی وفات کی خبر پا کر میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ مجھ پر ہی کیا موقوف، ہر آنکھ اشکبار تھی، ہر چشم گریاں تھی۔ ہر سینہ بریاں تھا۔ اور ہر آہ سوزاں تھی۔ اس عاشق خدا کا جنازہ جا رہا ہے لوگ جوق در جوق آنے لگے ہجوم ایک جلوس کی شکل اختیار کر گیا۔ لوگ بے قرار تھے، بے چین تھے کہ وہ اپنے مرشد کی بندہ نوازی سے محروم ہو گئے۔ دنیا مثل اس بیوہ کے ہو گئی

جس سے زبردستی اس کے خاوند کو چھین لیا گیا ہو، غرض ہر طرف کہرام کا عالم تھا عقیدت کی آنکھ جھکی تھی، شرافت اشکبار تھی، طہارت بال نوچ رہی تھی متانت کا چہرہ زرد تھا۔ فطانت مہر لب تھی۔ اس لئے کہ اب شرافتوں کا پروردگار اور طہارتوں کا علمبردار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے روپوش ہو رہا تھا، ادھر عالم بالا سے ملائکِ قدسی یک زبان اور ہم آہنگ ہو کر ترانۂ قدسی گا رہے تھے ؏

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

حضرت کا جنازہ پولیس کی بھاری جمعیت کی قیادت میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ شاہراہیں اداس تھیں۔ فضا مغموم تھی۔ ماحول غمناک تھا۔ لیکن جنازہ سسکیوں اور آہوں کے ہجوم کو چیرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ روحانی دنیا کے اس بادشاہ کی آمد کے احترام میں کاریں روک دی گئیں بسیں موڑ دی گئیں۔ پیدل سواروں سے کہا گیا۔ ایک طرف ہٹ جاؤ، بادشاہ سلامت آرہے ہیں۔ کہیں ان کے حضور میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے یہ دیدہ زیب منظر تھا اس لئے کہ بلندیوں سے گل لالہ برس رہا تھا کہیں کہیں چنبیلی کے پھول جنازہ سے آ کر لپٹ جاتے۔ گلاب کھل کر برسا۔ اور اس طرح برسا کہ ساری فضا عطر میں ڈوب گئی۔ ساڑھے چار بجے کے قریب جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ میں لایا گیا ہجوم ایک سیل رواں کی طرح امڈا آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا گویا ساری دنیا یونیورسٹی گراؤنڈ میں اپنا مسکن تلاش کرتے آئی ہے یہاں جنازہ پڑھا گیا پھر جنازہ حضرت کی آخری آرام گاہ کی طرف بڑھا۔ رمضان کا مہینہ تھا اللہ کی رحمتوں کا نزول ہو رہا تھا۔ شیطان کا منہ بند تھا۔ ہر طرف نکھرا ہوا ماحول تھا۔ لوگ اگرچہ روزہ دار تھے

لیکن کسی کو بھوک اور پیاس کا احساس نہ تھا بلکہ ہر ایک حضرت کے آخری دیدار کا بھوکا اور پیاسا تھا، اتنے میں نماز مغرب کا وقت قریب آگیا۔ اذان میں دس منٹ باقی تھے کہ حضرت کے جسم اطہر کو آغوش لحد میں اتار دیا گیا۔ آسمان کے سورج سے یہ روح فرسا منظر دیکھا نہ گیا۔ جلدی سے وہ کہیں خلاؤں میں جاکر ڈوب گیا۔ ایک آفتاب غروب ہوا۔ دوسرا آفتاب بھی دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا ؛

مطبوعات "میری لائبریری"

ادب و تنقید

ادب کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر سلام سندیلوی نے ادب اور اصناف ادب کا تجزیہ ہڈسن کی کتاب "سٹڈی آف لٹریچر" کی روشنی میں کیا ہے گویا ہڈسن کی کتاب کا اردو روپ ہے۔ قیمت دو روپے پچیس پیسے مجلد چار روپے پچاس پیسے

پنجابی ادب کی مختصر تاریخ: پروفیسر احمد حسین قریشی نے ڈاکٹر وحید قریشی کی نگرانی میں اپنی طویل تاریخ کا اختصار مرتب کیا ہے۔ گویا کوزے میں دریا بند ہے۔ قیمت صرف تین روپے

بہترین انشائی ادب: مرتب ڈاکٹر وحید قریشی، رجب علی بیگ سے دور حاضر تک اردو کے انشائی سرمایہ کی اہم تحریروں کا مجموعہ مصنفین کے حالات فہرست تصنیفات اور تصویروں کے ساتھ۔ قیمت پانچ روپے پچاس پیسے سفید کاغذ مجلد بارہ روپے

غبار خاطر: ابوالکلام آزاد۔ نثر میں شاعری کا سا انداز، مولانا کے جیل کے ایام میں لکھے ہوئے مکاتیب کا مجموعہ، عمدہ لکھائی چھپائی اور کئی خوبیوں کے ساتھ۔
قیمت تین روپے پچھتر پیسے مجلد سات روپے

ارنسٹ ہیمنگوے: طلیب بینگ نے نوبل انعام یافتہ ادیب کی زندگی اور تصانیف پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قیمت پونے دو روپے مجلد پونے تین روپے

ولیم فاکنر: ولیم وان اکونر نے نوبل انعام یافتہ ادیب کے حالات و خیالات پر تنقیدی مقالہ لکھا ہے۔ قیمت پونے دو روپے مجلد پونے تین روپے

دیوان آتش: مرتب مولانا حسرت موہانی و ڈاکٹر وحید قریشی طویل مقدمے کے ساتھ۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ مجلد ساڑھے تین روپے

تذکرہ: جس سے ہمارے دل مدتوں گرم رہیں گے۔ تاریخ و سیرت کی ایک عمدہ کتاب باطل کے خلاف جہاد: قیمت پونے چار روپے مجلد سات روپے

دیوان ولی: مولانا حسرت موہانی اور محمد خاں اشرف کا انتخاب اور مقدمہ
قیمت دو روپے۔ مجلد پانچ روپے

میدان عمل: منشی پریم چند کا ناول، ہندوستان کی سیاسی ہلچل کا آئینہ، سوانح و مقدمہ از خواجہ محمد زکریا قیمت ساڑھے چار روپے مجلد سات روپے

بُری بات: عادل رشید کا نیا ناول قیمت ساڑھے تین روپے مجلد سات روپے

کرن کرن اندھیرا: آغا اشرف نے ایک کامیاب ناول لکھا ہے نرالا اور جاندار کشمیر میں ہندوستانی مظالم کی تصویر قیمت ساڑھے چار روپے مجلد نو روپے

میرے بھی صنم خانے: قرۃ العین حیدر، ہمارے ناول نگاروں میں قرۃ العین اور ان کا یہ ناول بہت مشہور ہے۔ ہر دم تازہ، ہرا بھرا قیمت پونے چار روپے قیمت مجلد سات روپے

متاع ادب: جملہ اصناف سخن کی تاریخ کا تذکرہ، ادبا کی قلمی تحریروں کے ساتھ جملہ علوم پر اردو کتب کا تفصیلی جائزہ، یعنی کوزے میں دریا بند۔
قیمت سوا دو روپے، مجلد پانچ روپے

سلطانی محلوں کے راز: جمال پاشا الغزی، مترجم عبدالرزاق ملیح آبادی، ترکی سلاطین کے اندرون خانہ پر اسرار حالات و واقعات قیمت پونے چار روپے مجلد سات روپے

ننگی دھرتی: مس آئی لن چانگ، ترجمہ اشرف صبوحی، انقلاب چین کی زندہ تصویر جو چینی قوم کو کندن بنتے دکھا سکتی ہے۔ قیمت پانچ روپے

روپ متی : سید فیاض حسین نے سرزمین ہند کی عظیم دختر روپ متی کی شعلہ و شبنم شخصیت کا قصہ بڑی ہی رعنائی، نغمگی اور دلداری کے ساتھ لکھا ہے۔ قیمت ڈھائی روپے

پتھر کا دیس : عادل رشید : میر امن نے چار درویشوں کا قصہ لکھا تھا۔ عادل رشید نے چار لڑکیوں کا قصہ لکھا ہے جو قصہ چہار درویش سے بھی زیادہ دلچسپ عبرتناک اور پراسرار ہے۔ قیمت پونے چار روپے مجلد سات روپے

سہرے کے پھول : عادل رشید، حقیقتوں اور صداقتوں کے بیان کرنے کے نئے انداز میں ایک دلدوز اور سبق آموز ناول، شہد کی طرح میٹھا اور گلاب کی پنکھڑی کی طرح نازک۔ قیمت تین روپے مجلد سات روپے

آہٹیں : عادل رشید، جھونپڑے میں رہنے والے بھی انسان ہوتے ہیں یہ داستان ان ہی انسانوں کی حیات پیش کرتی ہے قیمت پونے دو روپے مجلد ساڑھے تین روپے

دل بھولتا نہیں : سید جعفر علی، ایک نئے ادیب کا نیا نیا، پیارا پیارا ناول، آپ بھی اس کو بھلا نہ سکیں گے۔ قیمت ڈیڑھ روپیہ

منزل منزل بھٹکے گا : عنایت اللہ، چار چھوٹے ناول جنہیں بعض نقادوں نے اردو کے دلچسپ ترین طویل مختصر افسانے قرار دیا۔ قیمت ڈھائی روپے مجلد چھ روپے

ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ : (رپورتاژ) سلمیٰ عنایت بیگم عنایت اللہ نے اپنے خاوند سے جدائی کے دنوں کی کہانی لکھی ہے یہ رپورتاژ ہی نہیں معاشرے کی بہت عمدہ کڑوی کسیلی روداد بھی ہے۔ قیمت ڈھائی روپے مجلد چھ روپے

خاک دل : عبدالسلام، چار ناولٹ نئی نسل کے جذباتی کرب کا فنکارانہ اظہار خلوص درد، آگہی کی تصویریں۔ قیمت سوا دو روپے مجلد پانچ روپے

افسانے

میرزا ادیب کے بہترین افسانے: مرتب پروفیسر عرش صدیقی، میرزا کے فن پر مبسوط مقدمے اور محاکمے کے ساتھ قیمت ڈھائی روپے مجلد چھ روپے

احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے: انتخاب اور مقدمے میں مظفر علی کا نام اور افسانوں میں ندیم کی عظیم شخصیت ہر چیز معیاری قیمت پونے چار روپے مجلد آٹھ روپے

زادِ راہ: منشی پریم چند، گیارہ افسانوں کا مشہور مجموعہ جس پر پروفیسر محمد زکریا کا مصنف کے حالات کے علاوہ افسانہ نگاری کے فن پر اور خاص طور پر زادِ راہ کے افسانوں پر تنقیدی مقدمہ بھی شامل ہے قیمت سوا دو روپے مجلد پانچ روپے

ادھ کھایا امرود: خان فضل الرحمٰن، اردو افسانے میں نووارد بھی ہیں پختہ کار بھی۔ بالکل نئی آواز، نیا اسلوب قیمت ڈھائی روپے مجلد چھ روپے

۱۹۶۳ کے افسانے: انتخاب و مقدمہ ڈاکٹر اعجاز نقوی قیمت ڈھائی روپے

۱۹۶۴ کے افسانے: " " " قیمت تین روپے مجلد چھ روپے

فاصلے: سیدہ عفرا بخاری کے افسانوں کا مجموعہ قیمت دو روپے مجلد پانچ روپے

۱۹۶۵ء کے منتخب افسانے: انتخاب و مقدمہ ڈاکٹر اعجاز نقوی قیمت ساڑھے تین روپے

لمحوں کے بھنور، آغا اشرف کے تازہ افسانے جس میں موجودہ پاک بھارت جنگ کی عکاسی بھی ہے۔ قیمت تین روپے مجلد سات روپے

افق سے افق تک: آغا اشرف کے افسانوں، ڈراموں کا مجموعہ قیمت پونے چار روپے مجلد آٹھ روپے

پتہ: مینیجر مکتبہ میری لائبریری لاہور ۲

* تنقید، ادب، ناول، افسانا

بہترین انشائی ادب	۵.۵۰
ادب کا تنقیدی مطالعہ	۲.۲۵
ادب اور تعصب	۱.۷۵
ولیم فاکنر	۱.۷۵
ارنسٹ ہیمنگوے	۱.۷۵
تنقیدی مضامین	۲.۵۰
غبار خاطر	۳.۷۵
دیوان غالب (فارسی)	۸.۰۰
انتخاب غالب	۰.۵۰
لذت آوارگی	۳.۰۰
پنجابی ادب کی تاریخ	۳.۰۰
دیوان ولی	۲.۰۰
دیوان مصحفی	۲.۵۰
دیوان آتش	۱.۵۰
دیوان جرأت	۲.۵۰
ولی، تنقیدی مطالعہ	۱.۷۵
متاع ادب	۲.۲۵
میرزا ادیب' بہترین افسانے	۲.۵۰
احمد ندیم' بہترین افسانے	۳.۷۵
زاد راہ معہ تنقیدی مقدمہ	۲.۲۵
فاصلے	۲.۰۰
میرے بھی صنم خانے	۳.۷۵
پتھر کا دیس	۳.۷۵
سہرے کے پھول	۳.۰۰
آہٹیں	۱.۷۵
منزل منزل دل بھٹکے گا	۲.۵۰
دل بھولتا نہیں	۱.۵۰
ادھ کھایا امرود	۲.۵۰
حریف آدم	۲.۵۰
دغاباز (ڈرامہ)	۱.۲۵
لفنگے کی ڈائری	۱.۷۵
چاند روشن نہیں ہے	۳.۰۰
63 کے منتخب افسانے	۲.۵۰
64 کے منتخب افسانے	۳.۰۰
میدان عمل معہ تنقیدی مقدمہ	۴.۵۰
ننگی دھرتی	۵.۰۰
لمحوں کے بھنور	۳.۰۰
کرن کرن اندھیرا	۴.۵۰
افق سے افق تک	۳.۷۵
ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ	۲.۵۰
خوشبو کے گھاؤ	۴.۵۰

* نفسیات

جینے کی اہمیت	۷.۵۰
میٹھے بول میں جادو ہے	۳.۵۰
پریشان ہونا چھوڑئیے	۳.۵۰
گفتگو اور تقریر کا فن	۲.۵۰
مانیں نہ مانیں	۲.۵۰
جنس کا نفسیاتی پہلو	۳.۰۰
جنس کا جسمانی پہلو	۳.۵۰
زندگی کے موڑ پر	۲.۲۵
شادی اور کامیابی	۲.۲۵
روزمرہ نفسیات	۲.۰۰
نفسیات اور عمل	۲.۰۰
زندگی اور عمل	۱.۵۰
نفسیات کی روشنی	۱.۵۰
ترقی کی راہیں	۲.۰۰
ہماری عادتیں' ہمارے جذبات	۱.۰۰
دولت نامہ	۲.۵۰
بچے اور انکی تعلیم و تربیت	۱.۷۵

* تاریخ و سوانح

ابوبکر صدیق اکبر رض	۶.۰۰
عمر، فاروق اعظم رض	۱۰.۰۰
دس بڑے مسلمان	۴.۰۰
خالد، سیف اللہ رض	۲.۲۵
المامون	۲.۲۵
الہارون	۲.۲۵
ابوذر غفاری رض	۲.۰۰
سلطان محمد فاتح رض	۱.۵۰
الحسین رض	۱.۵۰
رابعہ بصری رح	۱.۵۰
امیر معاویہ رض	۱.۲۵
عمر بن عبدالعزیز رح	۱.۲۵
امام زین العابدین رض	۱.۲۵
شیخ عبدالقادر جیلانی رح	۱.۲۵
الزہرا رض	۱.۰۰
تذکرہ	۳.۷۵
قلوپطرہ	۳.۷۵
روپ متی	۲.۵۰
سلطانی محلوں کے راز	۳.۷۵
39 بڑے آدمی	۳.۷۵

* شکار، علم، مذہب

حلال و حرام (مذہب)	۲.۲۵
معلومات کا انسائیکلوپیڈیا	۳.۷۵
شیر، شیر، شیر (شکار)	۳.۰۰
بنیادی انسانی حقوق کا مسئلہ	۲.۲۵
لباس کا مسئلہ اور ٹیڈی ازم	۰.۵۰

شیخ التفسیر مولانا احمد علیؒ



تاریخ پیدائش : ۲ رمضان ۱۳۰۴ھ تاریخ وفات : ۱۷ رمضان ۱۳۸۱ھ



چودھری محمد یوسف

آج سے تقریباً تیس برس قبل آپ گوجرانوالہ کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپکے والد حکیم حبیب اللہ صاحب مشہور طبیب ہیں۔ اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ سے میٹرک اور گارڈن کالج راولپنڈی سے ۱۹۶۱ء میں ایم۔اے اردو اور ۱۹۶۵ء میں ایم۔اے فارسی کیا اسلامیہ کالج لاہور کینٹ کے پرنسپل ہیں۔

مکتبۂ میری لائبریری، لاہور

طباعت رپن پرنٹنگ پریس لمیٹڈ۔ بل روڈ۔ لاہور